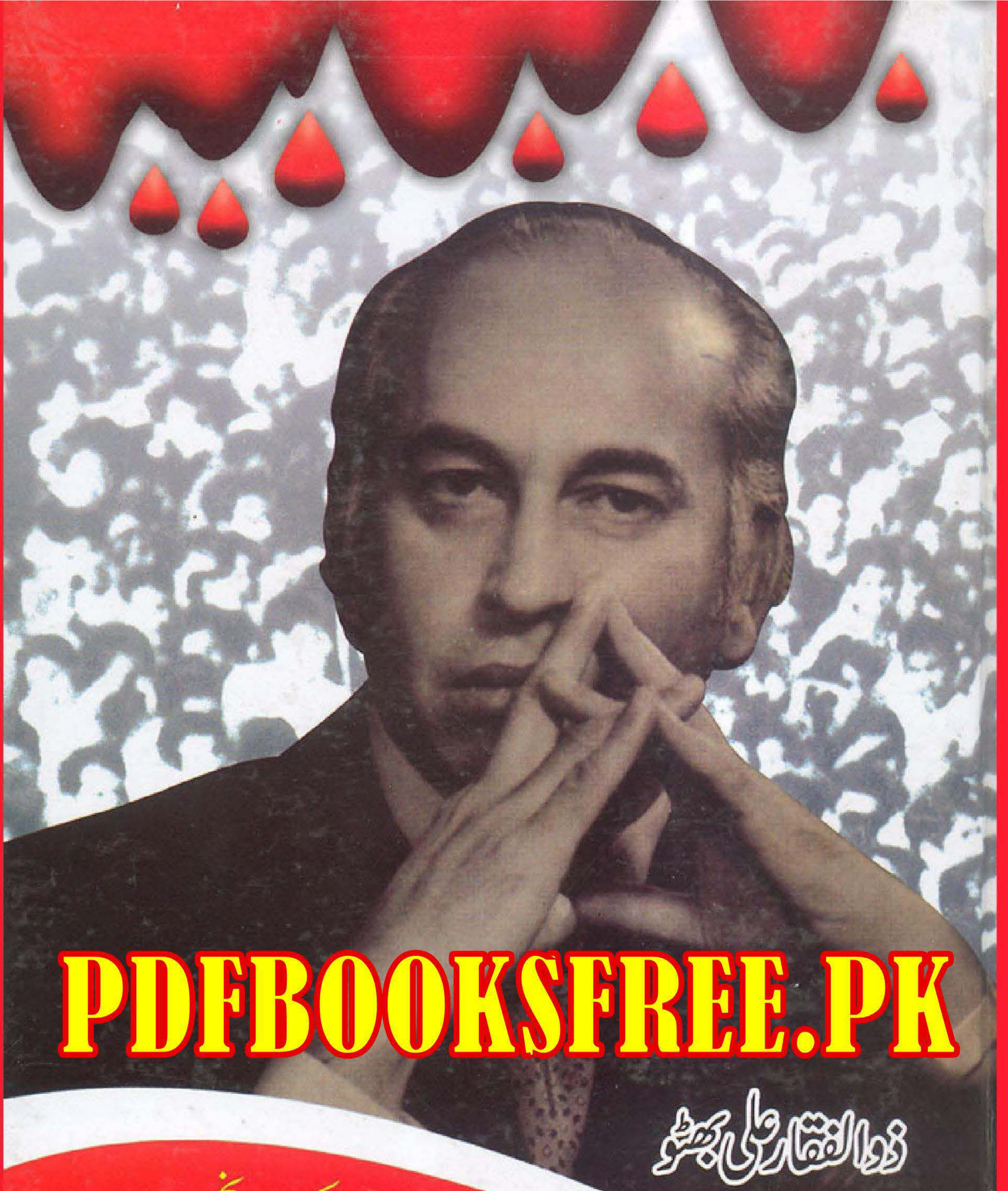


ذوالفقار علی بھٹو

ایک تاریخی دستاویز

قاتل کون؟

ایک ایک لفظ سچ

قومی اور بین الاقوامی سازشوں کا مثبت جواب

Reporoduced by:

Sani Hussain Panhwar

Member Sindh Council, PPP

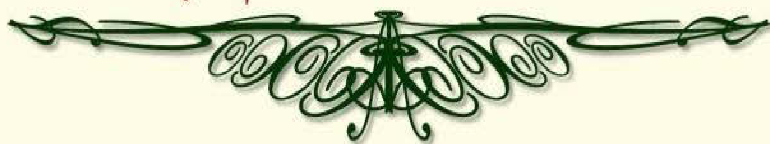
بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



فروری 2008ء

قیمت: -/150 روپے

آغا امیر حسین

کلاسیک ناشر و تاجر

چوک ریگل ۔ ۴۲ دی مال لاہور ۔۔۔ ۵۴

فون: 7312977 فیکس: 7323963

Email:agha@classicpublishers.com

www.classicpublishers.com

طابع:

سید ندیم حسین آغا

سپوتنک پرنٹرز

C-13 فین روڈ لاہور

موبائل: 0300-4442227

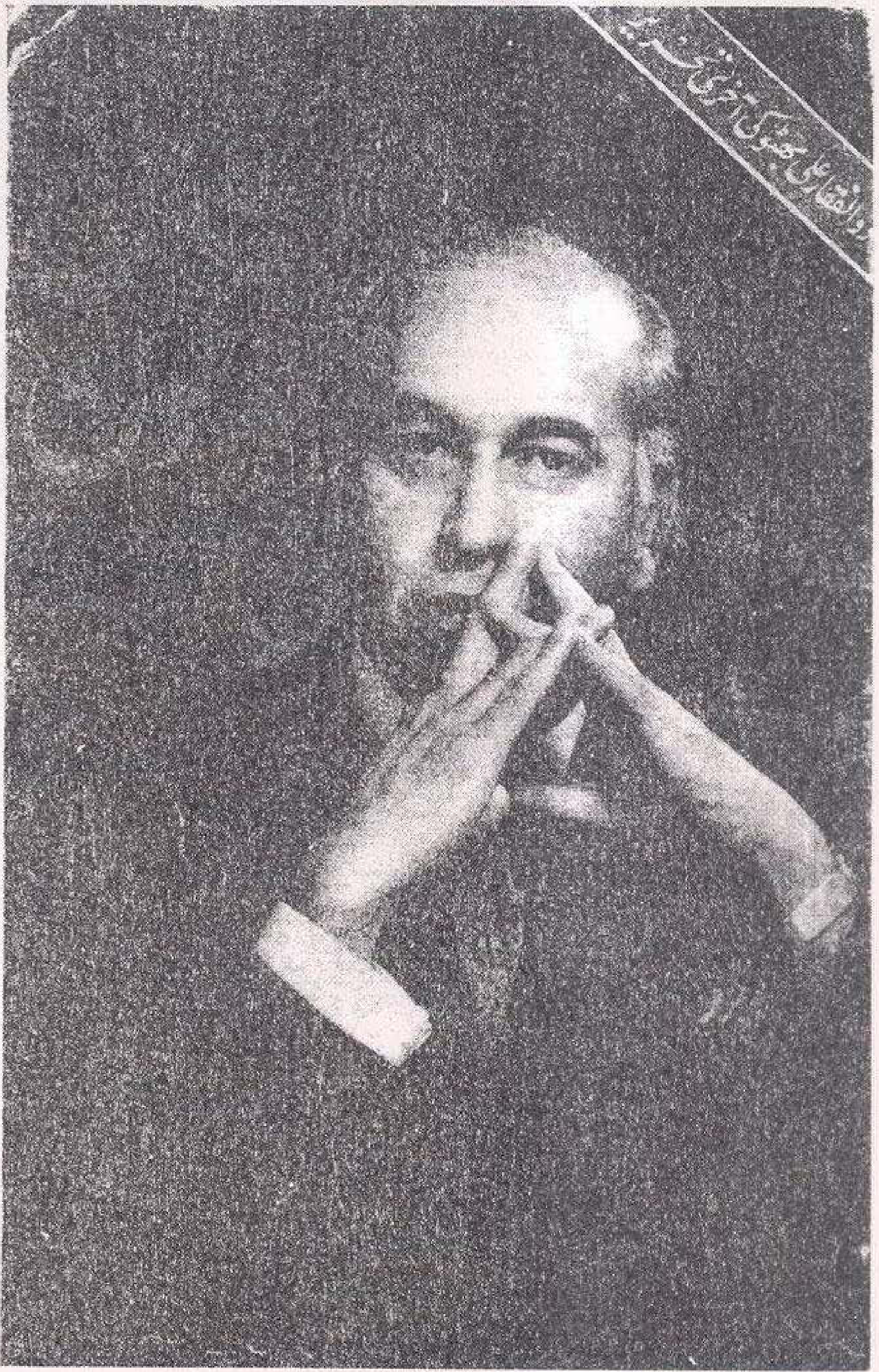


ترتیب

ضمیمہ جات

سرِورق

کینیڈا کے مشہور فوٹو گرافر کاش کی بنائی ہوئی ایک غیر مطبوعہ تصویر



گـــــزارش

ذوالفقار علی بھٹو کو جسمانی طور پر مٹانے والوں نے سوچا تھا کہ اس سے بھٹو ختم ہو جائے گا۔ ابھی اس سانحہ کو چند ماہ گذرے ہیں، مگر یہ حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ مزدہ بھٹو زندہ بھٹو سے زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہا ہے اور دن بدن اس طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جناب بھٹو اپنی عظیم قربانی اور اپنے انقلابی نظریات کے ذریعے نہ صرف آج زندہ ہیں بلکہ تاابد زندہ رہیں گے۔ ان کا علم چن کر عشاق کے قافلے نکلتے رہیں گے جب تک کہ آزادی اور انقلاب کی منزل نہ پالیں۔

''قاتل کون'' جناب بھٹو کے امر نظریات کو کتابی شکل میں اکٹھا کرنے اور عوام تک پہنچانے کی ایک عاجزانہ کوشش

ہے۔ عوام کے مقبول اور خوددار رہنما نے اپنے خلاف گھناؤنی بین الاقوامی سازش کے بارے میں خود اہم حقائق کا انکشاف کیا ہے اور گھٹیا پروپگنڈا بازوں کا دندان شکن جواب جیل کی کوٹھری میں تحریر کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اور ایک عظیم رہنما کے آخری دنوں کے تاثرات کا نادر مجموعہ بھی۔

اس کتاب کے مطالعے سے ملکی اور عالمی سطح پر تیسری دنیا، بالخصوص عالم اسلام کے دشمنوں کے چہرے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور عوام کی جدوجہد کے رہنما اصول واضح ہو جاتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میری اس حقیر سی کوشش کے نتیجے میں اس تاریخ ساز شخصیت کے افکار عوام تک پہنچ جائیں گے اور ان سے رہنمائی حاصل کر کے پاکستان کے دلیر اور غیور عوام اس مشن کو پورا کرنے کی جنگ جاری رکھیں گے، جس کی خاطر جناب بھٹو نے جان کی قربانی دی۔

رفیق عارف

چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی

سکاٹ لینڈ

اگست 1979ء

تعارف

تیسری دُنیا کا رزمیہ

یہ کتاب ایک دستاویز ہے' ایک عہد ساز شخصیت کی تاریخی دستاویز۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا' اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی اور مستقبل کا مؤرخ اسے ہمارے دور کا سب سے مستند اور جامع تبصرہ قرار دے گا۔

اس کتاب کا مصنف تیسری دنیا کا ممتاز ترین رہنما ہی نہیں تھا بلکہ اپنی ذہانت' بصیرت اور قابلیت کے لحاظ سے عالمی رہنماؤں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا تھا۔ عالمِ اسلام اور جنوبی ایشیا کی جدید تاریخ میں اس پایے کا قائد مشکل ہی سے نظر آتا ہے' جس نے ایک پسماندہ اور کمزور ملک کی قیادت کرتے ہوئے سپر پاورز سے ٹکر لینے کی ہمت کی اور مرتے دم تک بے جگری سے لڑتا رہا۔ مزاحمت اور استقامت کی یہ سورمائی داستان ہمیشہ وطن کے سپوتوں اور حریت کے متوالوں کے لہو گرماتی رہے گی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس بطلِ جلیل کے آخری معرکے کی روداد کتابی صورت میں محفوظ ہوگئی ہے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو نے یہ کتاب موت کی کال کوٹھری میں کاغذ کے پرزوں پر لکھی اور خفیہ طریقے سے جیل سے باہر اسمگل کی۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل فوجی حکومت نے پریس پر

چھاپہ مار کر تمام مواد ضبط کر لیا (اور ناشر کو جیل بھیج دیا)۔ سپریم کورٹ نے عدالتی دستاویز کی حیثیت سے بھی اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔ جب مسودہ ملک سے باہر پہنچ گیا اور شائع ہو گیا' تو اسے ملک میں لانا جرم ٹھہرا۔ مگر آج یہ کتاب پاکستان سے دلچسپی رکھنے والے افراد' گروہوں یا ملکوں تک پہنچ چکی ہے اور پاکستان کے بد بخت فوجی حکمران بھٹو شہید کے نظریات کا گلا گھونٹنے میں ناکام رہے ہیں۔ جتنا وہ انھیں دباتے ہیں' اتنا ہی ان کی طاقت اور وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

''قاتل کون'' بھٹو شہید کے وائٹ پیپر کے جواب' سپریم کورٹ سے آخری خطاب اور بعض دوسری دستاویزات کا مجموعہ ہے اور ان کے مطالعہ سے جناب بھٹو کے قاتلوں کے چہرے سے نقاب اٹھ جاتا ہے۔ سیاسی گدھ' وردی پوش بھیڑیئے' دین فروش ملّاں' بے ضمیر افسر' خون آشام سرمایہ دار اور ان کے سرپرست سامراجی — ''قاتل کون'' کے صفحات میں یہ تمام گھناؤنے چہرے پہچانے جا سکتے ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف زبردست بین الاقوامی سازش سے پردہ اٹھتا ہے۔ یہ ایک دہلا دینے والی کہانی ہے کہ کس طرح تیسری دنیا اور عالم اسلام کے اتحاد کے اس عظیم علمبردار کو اس کی سامراج دشمنی اور وطن دوستی کی سزا اس کے اپنے ہی ہم وطنوں اور شکر گذاروں کے ذریعے دلوائی گئی۔ اس فوج کے ذریعے' جسے اس نے مکمل شکست کے بعد پھر عزت اور اعلیٰ مقام دلوایا۔ اس مذہب کے نام پر' جس کی اس نے دن رات خدمت کی۔ ان دوستوں اور رفیقوں کے ذریعے' جن کی اس نے پردہ پوشی کی اور اعتماد کیا۔

اس کتاب میں نہ صرف ان چہروں کے منہ سے نقاب نوچا گیا ہے بلکہ تیسری دنیا کے ممالک میں سامراج کی نئی حکمتِ عملی اور نظریاتی ہتھکنڈوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ عظیم تاریخی بصیرت کے ساتھ جناب بھٹو نے تیسری دنیا کی سامراج کے خلاف جدوجہد کے خدوخال واضح کر دیئے ہیں' راہ متعین کر دی ہے اور انھیں جسمانی طور پر راہ سے ہٹانے سے یہ جدوجہد آہستہ نہیں بلکہ تیز تر ہو گی۔ جناب بھٹو نے جرنیل راج کو تیسری دنیا کے عوام کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا ہے' وہ پل' جس سے گذر کر سامراج اپنا تسلط جماتا ہے۔ یہ ایک چونکا دینے والا تجزیہ ہے اور اس وقت عالمی منظر پر نظر ڈالیں تو اس نظریے کی سچائی پر شبہ نہیں رہتا۔

جناب بھٹو پاکستان کے شہید ہیں۔وہ پاکستان کے لئے جئے' پاکستان کے لئے جان دی۔اور آج بھی انہی کا نظریہ' انہی کی جماعت اس ملک کو متحد رکھنے والی واحد قوت ہے۔انھوں نے بجا فرمایا تھا کہ ایک دن میری ہڈیاں بھی پاکستان کے اتحاد کے لئے سیمنٹ کا کام دیں گی۔

ہم پاکستانیوں کے لئے شہید پاکستان کے نظریات اور ان کی عظیم مثال مشعل راہ ہے۔ ہمیں اس مشن کو پورا کرنا ہے' جس کی خاطر جناب بھٹو نے جان دی۔ہمیں ان کے پاکستان کو بچانا اور مضبوط بنانا ہے۔ہمیں ان کے شیدائی غریب عوام کی نجات اور خوشحالی کے لئے انقلابی تبدیلی لانا ہے۔ہمیں عالم اسلام اور تیسری دنیا کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا ہے۔یہی ہمارا انتقام ہے' یہی ہمارا اخراجِ عقیدت۔یہ کیڑے اور کیکڑے تو اس عظیم مارچ کے دوران یوں کچلے جائیں گے کہ ان کا نام ونشان تک بھی نہ ملے گا۔

جناب بھٹو میرے رہنما ہی نہیں' میرے شفیق استاد اور مہربان دوست بھی تھے۔میں نے سیاست کی الف بے انہی سے سیکھی۔ان کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں۔جنھیں میری نسلیں بھی اتار نہ سکیں گی۔مگر وہ میری قوم کے بھی محسن ہیں اور ہم غیرت مند لوگ ہیں۔جب تک دم میں دم ہے' بھٹو اور پاکستان کے دشمنوں سے لڑتے رہیں گے۔اور جب تک ان دشمنوں میں سے ایک بھی باقی ہے' ہماری جنگ جاری رہے گی۔جناب بھٹو کے افکار اس جنگ میں ہمارا حوصلہ' ہمارے ہتھیار ہوں گے۔ان افکار کو کتاب کی صورت میں جمع کرنے اور شائع کرنے پر میں ''قاتل کون'' کے ناشر اور اپنے دوست رفیق عارف اور ترجمے اور تدوین کے لئے شاہد محمود ندیم صاحب کا شکر گزار ہوں۔

G. Mustafa Khar

لندن

۲۷ جولائی ۱۹۷۹ء

سوانحی خاکہ

- وہ بھٹو خاندان کے چشم و چراغ تھے جو ساتہ خاں مٹھا خاں کی قیادت میں ضلع لاڑکانہ میں اس وقت پہنچا جب اورنگزیب عالمگیر کا آخری عہد تھا۔
- بھٹو خاندان نے ۱۰۵۰ ہجری میں حصار ضلع انبالہ کے بھاٹیہ مقام سے ہجرت کی۔
- البیرونی کی رو سے یہ خاندان محمود غزنوی کے زمانہ میں پہلے بھی سندھ میں آباد رہ چکا تھا اور اس نے محمود غزنوی کے عہد میں اپنے اصل وطن کو چھوڑا کہ اس وقت یہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔ کہیں بعد میں اسلام لایا۔
- یہ کلہوڑا عہد تھا جب بھٹو خاندان کا مٹھا خاں لاڑکانہ پہنچا اور پھر کلہوڑا خاندان کے شاہ علی کے ساتھ مل کر نئی قسمت رقم کی۔
- میرانِ تالپور سے بھی اس خاندان کے تعلقات اچھے رہے۔
- انگریز کے عہد میں اس خاندان کے جس بزرگ نے انگریزوں سے تعلق جوڑا وہ غلام مرتضیٰ خان تھے۔ جو ذوالفقار علی بھٹو کے والد گرامی سر شاہنواز کے باپ تھے۔
- سر شاہنواز، انگریزوں کے وزیر بھی رہے۔ مشیر بھی، مگر یہ خوبی ضرب المثل ہے کہ انھوں نے ضمیر کی آواز ہمیشہ سنی اور سندھ بمبئی سے کبھی الگ نہ ہوتا اگر سر شاہنواز اس کے

لئے انگریز سے چونکھی لڑائی نہ لڑتے۔

- گڑھی خدا بخش ان کا آبائی گاؤں ہے جو خدا بخش خاں نے آباد کیا تھا اور جہاں وہ خود بھی' ان کے باپ بھی' سرشاہنواز بھی اور ان کی بیگم بھی ملحقہ مسجد کے صحن میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔
- جناب سرشاہنواز کے ہاں بھٹو صاحب ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو اس وقت پیدا ہوئے جب سرشاہنواز لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئر مین تھے۔
- انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ پھر باپ کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور کیتھڈرل سکول سے سینیئر کیمرج کا امتحان پاس کیا۔
- پہلے کیلی فورنیا یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس اور انٹرنیشنل لا میں سندِ فضیلت حاصل کی پھر لن کولن ان میں داخل ہوئے۔
- ۱۹۵۳ء میں وطن لوٹے
- سیاسی ناموری کی سمت سفر اس وقت شروع کیا جبکہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی پہلی بار کی۔
- ایوبی کابینہ میں شامل ہو کر (۱۹۵۸) پہلی زرعی اصلاحات کا منصوبہ بنایا ایوبی کابینہ کے وہ تنہا رکن تھے جنھوں نے زرعی اصلاحات کے وقت اڑتیس ہزار ایکڑ زمین کی ملکیت بخوشی قوم کی نذر کی۔
- وزیر خارجہ بننے کے بعد انھوں نے پہلا بڑا کام یہ کیا کہ چین سے دوستی کا رشتہ جوڑا اور پھر یہ رشتہ برابر مضبوط ہوتا رہا۔
- ستمبر ٦٥ کی جنگ صرف انھوں نے لڑی اور جو کارنامے پاکستانی فوج نے سرانجام دیے ان میں ان کی قیادت کا بڑا دخل ہے۔
- سلامتی کونسل میں خطابت اور قومی نمائندگی کے سارے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔
- معاہدۂ تاشقند کے وہ سخت دشمن تھے اور یہ دشمنی ان کے اور ایوب خان کے مابین اختلاف

کی اول وآخر باعث بنی اور اسی کی بنا پر وہ ایوب خان کی وزارت سے مستعفی ہوئے۔

- وہ پہلے سیاست دان تھے جنھوں نے ایوب خان جیسے آمر کے خلاف عملی جدوجہد شروع کی اور ۳۰ نومبر ۱۹۶۷ میں اس پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۹۷۰ کے انتخابات کچھ اس طرح جیتے کہ سارے قدآور سیاسی بت منہ کے بل گر پڑے۔
- اسلامی سوشلزم کی طرح نو ایجاد کی۔ اور پھر یہ نعرۂ مستانہ ملک کے گوشے گوشے میں یوں گونجنے لگا جیسے' یہ نعرہ ابدی اور ازلی سرچشموں کے اندر سے پھوٹا ہے۔
- ایوب نے انھیں جیل میں ڈالا۔ مگر یہ جیل آپ ہی آپ ان کے اندر سے پھوٹتی شعاعوں کی آنچ سے جل کر راکھ ہو گئی۔
- انھوں نے ایوب خان کے اقتدار کو چیلنج ہی نہیں کیا اسے حکومت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یحییٰ خان نے جب اقتدار سنبھالا تو بھٹو صاحب اس ملک کے عوام کی زبان بھی بن چکے تھے اور ضمیر کی شکل بھی اختیار کر لی تھی۔
- اور پھر جب فوجی جرنیلوں نے ملک کے ٹکڑے کر دیئے اور قوم کو شرمناک شکست سے دو چار کیا' تو عوام کے انتقام سے بچنے کے لیے حکومت منتخب رہنما جناب بھٹو کے حوالے کر دی۔ جناب بھٹو نے ٹکڑوں کو یکجا کر کے نئے پاکستان کی تعمیر شروع کر دی۔ نوّے ہزار فوجی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کروایا۔ دشمن سے ۵ ہزار مربع میل کا مقبوضہ علاقہ آزاد کرایا اور شیخ مجیب کو فوجی جرنیلوں کو پھانسی پر چڑھانے سے باز رہنے پر آمادہ کیا۔
- بنیادی صنعتوں کو قومیا لیا۔ زرعی اصلاحات کیں۔ تعلیمی اداروں کو سرکاری تحویل میں لیا۔ لیبر اصلاحات کیں اور اسلامی سوشلزم کے خواب کی تعبیر کا بیڑہ اٹھایا۔
- سرمایہ داروں' ملاؤں اور سامراجی گماشتوں کے مفادات کو نقصان پہنچا تو وہ جناب بھٹو کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اور سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تیسری دنیا کی کانفرنس' اسلامی ملکوں کے اتحاد' فلسطین کی آزادی کی عملی حمایت اور ایٹمی پلانٹ

کے معاہدے کے باعث سامراج نے بھرپور وار کیا۔

- قومی اتحاد نے فوجی جرنیلوں اور سامراجی آقاؤں کی مدد سے تحریک شروع کی اور جب تحریک ناکام ہونے لگی اور سیاسی سمجھوتے کی شکل بننے لگی تو جرنیلوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور جناب بھٹو کو سیاسی طور پر ختم کرنے کے لئے تمام حربے آزمائے۔
- بھٹو کی مقبولیت ختم کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ان کے سیاسی اور نام نہاد عدالتی قتل کا عمل شروع کیا گیا۔ جناب بھٹو نے بے مثال جوان مردی اور وقار سے موت کا سامنا کیا اور فوجی جنتا سے رحم کی اپیل کرنے کی بجائے پھانسی کے پھندے کو چوما۔ اور یوں ابدی زندگی حاصل کر لی۔



۱......

ایک شاعر - ایک انقلابی

موت کی کال کوٹھری میں بیٹھے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کی تصویر کھنچ رہی ہے۔ زندگی، جو میں نے اپنے عوام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ میرا ذہن ہر لحظہ بدلتی، بڑھتی ہوئی عظیم الشان سیاسی بیداری کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ انسان انقلاب کی منزل کی طرف کشاں کشاں بڑھ رہا ہے۔ وہ تہیہ کر چکا ہے کہ استحصال کے غاصبانہ نظام سے اپنے حقوق چھین کر رہے گا۔

اپنی قیدِ تنہائی میں بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے ماضی کو ایک بار پھر گذار چکا ہوں۔ میرے حافظے کی سکرین پر جو مناظر چلتے ہیں، وہ جنتِ نظارہ ہیں۔ متعدد یادگار واقعات نظروں کے سامنے ہیں تقسیم ہند، نوجوانوں کا باغیانہ جذبہ، سورمائی جدوجہد، پاک بھارت جنگیں، سیکورٹی کونسل، عالمی دیوؤں کے ساتھ ذہنی پنجہ آزمائی۔

ماضی کے ان رنگا رنگ اور چکا چوند کرنے والے جھروکوں سے اگر مجھے کوئی منظر منتخب کرنے کو کہا جائے تو میں ۱۹۶۵ کی جنگ میں اپنی خدمات نہیں چنوں گا، نہ ہی اس تخلیقی دوطرفہ خارجہ پالیسی کے منظر کو جس نے میرے ملک کو عظمت و وقار بخشا۔ نہ ہی میں اس دور کا انتخاب

کروں گا جب ۱۹۷۱ء میں میں نے ایک ٹکڑے ٹکڑے‘ شکست خوردہ ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ میں شملہ معاہدے کا ذکر بھی نہیں کروں گا اور شاید میں اس خون‘ پسینے اور آنسوؤں کا بھی حوالہ نہ دوں جو میں نے اپنے عوام کے چہروں پر مسکراہٹ اور روحوں میں طمانیت پیدا کرنے کے لئے بہائے۔ ان ہم وطنوں کے لئے جنھوں نے قدیم سندھ کے موہنجوڈارو کے زمانے سے بہت دکھ سہے ہیں‘ بہت آنسو بہائے ہیں۔

حالیہ واقعات اور صورتحال کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ میرا جو کارنامہ میری عوامی زندگی کے کینوس پر چھا جائے گا وہ معاہدہ ہے جو گیارہ برس کے انتھک اور پیچیدہ مذاکرات اور مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں شرمندۂ تعبیر ہوا تھا۔ آج کے تناظر میں ۱۹۷۶ء میں طے پانے والا فرانس سے جوہری معاہدہ‘ اپنی قوم اور اپنے عوام کی بقا اور ترقی کے لئے میری سب سے بڑی کامیابی‘ سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

اپنی اکیسویں سالگرہ پر ۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاس اینجلز میں مجھے لاڑکانہ سے کچھ تحفے موصول ہوئے تھے۔ ایک سولین کی لکھی نپولین بوناپارٹ کی سوانح عمری کا پانچ جلدوں پر مشتمل بیش قیمت سیٹ تھا۔ دوسرا ایک بے قیمت پمفلٹ تھا۔ نپولین سے میں نے اقتدار کی سیاست کے رموز سیکھے اور اس پمفلٹ سے غریبوں کی سیاست کا سبق لیا۔ پمفلٹ کے آخری الفاظ تھے۔

”دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ۔ تمہارے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں‘ سوائے تمہاری زنجیروں کے۔ اور پوری دنیا تسخیر کرنے کے لئے پڑی ہے۔“

نوجوانی ہی کے دنوں میں برطانوی سامراج کا زبردست دشمن رہا ہوں۔ میں نے بمبئی کے کیتھڈرل اور جون کینٹن ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ یہ برصغیر کا بہترین انگریزی اسکول تھا۔ اس کے باوجود ایک اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے میں اپنی سیاسی سرگرمیوں‘ خصوصاً ”ہندوستان چھوڑ دو“ اور ”راست اقدام“ کے سلسلے میں سرگرمی کی وجہ سے مشکلات سے دوچار رہتا تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے‘ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ تب میں صرف سات سال کا تھا۔ میرے والد جو اس وقت حکومت بمبئی کے وزیر تھے‘ کو بمبئی کے گورنر لارڈ ہاربون نے چائے پر مدعو

کیا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی، جو اس وقت ۲۱ برس کے تھے، کا لارڈ ہار بوان سے تعارف کرایا گیا۔ تو لارڈ نے کہا۔ ''بڑا خوبصورت نوجوان ہے''۔

امداد علی آخر مہذب شرفاء کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے جواب میں نہایت شائستگی سے کہا:

''یہ میرے لئے باعثِ فخر ہے، خصوصاً اس لئے کہ یہ جملہ ایک خوبصورت گورنر کی طرف سے کہا گیا ہے۔''

مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنی باریک سی آواز میں، میں اپنی باری کا انتظار کئے بغیر بول اٹھا:

''جناب گورنر اس لئے حسین نظر آتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے حسین وطن کے لہو پر پلے ہیں۔''

لارڈ صاحب سپٹا گئے۔ لمحہ بھر کو ہکے بکے مجھے تکتے رہے۔ پھر مسکرائے اور میری طرف اشارہ کر کے میرے والد سے مخاطب ہوئے:

اور اس لڑکے میں، سر شاہنواز! مجھے ایک انقلابی اور ایک شاعر یکجا نظر آ رہے ہیں۔''

اور میں زندگی بھر یہی رہا ہوں۔ ایک شاعر اور ایک انقلابی۔ اور اسی طرح رہوں گا، جب تک میرے جسم میں ایک سانس بھی باقی ہے۔

یہی جدوجہد تھی، جو میں نے برکلے میں تعلیم کے دوران جاری رکھی تھی۔ امریکہ میں جنم لینے والے نوآبادیاتی نظام کے خلاف یا سیاہ فاموں کی ہر انقلابی تحریک میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ برطانیہ میں مجھے کرائسٹ چرچ، آکسفورڈ، اور بعد میں لنکن ان میں زیر تعلیم رہنے کا اعزاز حاصل رہا۔ آکسفورڈ اور لندن، دونوں جگہ میں حریت پسندوں کی جدوجہد کے ہراول دستے میں رہا۔

حکومتِ پاکستان کے وزیر کی حیثیت سے میں نے ہر پلیٹ فارم پر شدت، جوش و جذبے اور پورے ایمان کے ساتھ نوآبادیاتی نظام کے خلاف ان تھک جدوجہد کی۔ میکملن سے ہیتھ تک ہر برطانوی وزیراعظم سے میری اسی موضوع پر گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے میں نے برطانوی دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اختیار کی۔ جب میں وزیراعظم تھا تو میں نے برطانوی تاج کے ہیروں میں سے کوہِ نور کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ سات سال سے پچاس

سال کی عمر کا فاصلہ کم نہیں ہوتا۔

گورنر کی دعوت سے واپسی پر جب میرے والد نے مجھ سے پوچھا

''سائیں! اس فقرے کی کیا ضرورت تھی۔''

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے اور سسکیاں لیتے ہوئے میں سندھی میں چیخ اٹھا:

''ایہوا ساں جو ملک آ ہے' ایہوں اساں جو ملک آ ہے' ایہوں اساں جو ملک آ ہے۔''

(یہ ہمارا ملک ہے' یہ ہمارا ملک ہے' یہ ہمارا ملک ہے)

نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں پھنسے ہر ملک کو میں نے ''اساں جو ملک'' سمجھا ہے۔ تیسری دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ''جرنیل راج'' (Coup-Gemony) ہے۔ تلخ تصادم کی وجوہات ختم ہو گئی ہیں اور ان کی جگہ انقلابی تبدیلیوں نے لے لی ہے۔ برطانوی حکومت اور عوام نے میرے تین بچوں اور میرے ساتھیوں کو عزت مندانہ طریقے سے جو پناہ دی ہے' میں اس کا مشکور ہوں۔ میں نے برطانوی رہنماؤں اور حکومتوں سے ایشیا کی ذہنی اور اخلاقی برابری کے لئے لڑائی کی تھی۔ آج برطانویوں سے لڑائی ختم ہو گئی ہے۔

پچھلے تیرہ سالوں کے واقعات سے میں نے ایک انتہائی واضح نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ یہ کہ آج تیسری دنیا کے اتحاد اور ترقی کو سب سے بڑا خطرہ ''جرنیل راج'' سے لاحق ہے۔ فوجی بغاوتیں قومی اتحاد کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ فوجی بغاوتیں آزاد انسانوں کو تقسیم اور مسخ کر دیتی ہیں۔ اگر اس تجزیئے کی صداقت میں کوئی شبہ ممکن بھی تھا تو پاکستان کے واقعات نے تیسری دنیا کے عوام پر یہ حقیقت عیاں کر دی ہے کہ انھیں بنیادی طور پر اس اندرونی دشمن سے خبردار رہنا ہے۔ تبھی غیر ملکی غلبے اور تسلط پسندی کی مزاحمت ممکن ہے۔ جرنیل راج وہ پل ہے جس سے گزر کر سامراج ہماری سرزمین پر اپنے منحوس قدم رکھتا ہے۔

۲......

جرنیل راج

فوجی انقلاب ایک ناخوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ یہ انتہائی خوفناک روایات اور ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ اگر فوجی انقلاب سیاسی ڈھانچے کا مستقل حصہ بن جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ جمہوریت کے سوکھے گلاب کی آخری پتی کو بھی نوچ لیا گیا۔ یعنی سیدھی سیدھی تباہی۔ عہدِ قدیم سے بے شمار قومیں وجود میں آئی ہیں۔ مگر ابدی اقوام بھی اس قسم کی مہم جوئی یا حماقت کا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔ عالمی جنگوں کے بعد آزادی حاصل کرنے والی اقوام تو کسی صورت بھی اپنے اتحاد اور سلامتی کو اس طرح داؤ پر نہیں لگا سکتیں۔ موجودہ ریاستوں میں سے نئی مملکتوں کا وجود عوام کی مرضی سے ہوا کرتا ہے۔ عوام کی مرضی اور ان کی قربانیوں کے بغیر اس قسم کی مملکتیں وجود میں نہیں آ سکتیں۔ اور اگر یہ مملکتیں اپنے قیام اور اپنے اتحاد کی ضمانت نہیں بن سکتیں، تو ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔

جب مملکتوں کی بقا کا انحصار چیف آف آرمی اسٹاف کی کرسی پر ہونے لگے تو اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا۔ قائداعظم نے کبھی بھی فوج کے لئے کسی مستقل سیاسی کردار کا سوچا تک نہ تھا۔ یہ خیال ہی ان کے لئے تکلیف دہ تھا۔ کاکول میں کیڈٹوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے

نصیحت کی تھی کہ وہ حکومت اور آئین کے صحیح معنوں میں اور مکمل طور پر وفادار رہیں۔ مجھے قائد کی یہ تقریر یاد نہ تھی۔ یہ تو مجھے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ضیاء الحق نے جون ۱۹۷۷ء کے آخر میں یاد دلائی' جب میں مشرقِ وسطیٰ کے مختصر دورے پر روانہ ہو رہا تھا۔ وہ میری کراچی کی رہائش گاہ سے میرے ہمراہ ہوائی اڈے آ رہے تھے اور راستے میں اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف نے کہا تھا کہ میری حکومت سے ان کی وفاداری قائداعظم کے فرمان کے مطابق ایک واضح اور لازمی فریضہ ہے۔

تہذیب کا مطلب مہذب شہری حکمرانی ہوتا ہے۔ فوجی انقلابات کا مطلب تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ یورپ کے پاکستان (یعنی جرمنی) میں بھی ایڈولف ہٹلر نے فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ جس طرح ہمار یحیٰی خان منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے سے ہچکچاتے رہے' اسی طرح چانسلر ہینڈن برگ نے بھی جرمنی کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے میں تامل کیا تھا۔ انھوں نے ہٹلر اور اس کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو اقتدار تبھی سونپا جب بیرن وان پاپین نے بیمار چانسلر کو یقین دہانی کرادی کہ وہ ہٹلر سے نمٹ لے گا۔

ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا انقلاب' اور فرانس اور برطانیہ کے پروردہ یونانیوں کے خلاف شاندار کامیابیوں کے باعث حکمران بنے۔ ایران میں رضا شاہ نے ایران کے اتحاد کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تحریک چلائی۔

صرف ایک مثال ایسی ہے جب کسی فوجی انقلاب نے کسی ملک کے عوام کے مفادات کو تقویت بخشی ہے۔ اور وہ ہے نپولین بوناپارٹ کا انقلاب۔ مگر نپولین ایک عظیم انسان تھا۔ اس جتنا مکمل اور باصلاحیت انسان شاید ہی کوئی ہو۔ اس کی فوجی بصیرت اس کے ہمہ جہت جینئس کا صرف ایک پہلو تھی۔ اس کا نپولینائی ضابطہ بہت سے ملکوں میں ابھی تک بنیادی قانون شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی منتظم تھا' ایک مفکر بھی اور ایک خواب دیکھنے والا بھی۔ میری رائے میں اس کی نیچر چارلس ڈیگال کی نیچر سے بہتر تھی مگر ان عظیم صلاحیتوں کا حامل فوجی ڈکٹیٹر بھی فرانس کو واٹرلو کے المیے ہی کی طرف لے گیا۔

وہ بہت مشکل زمانہ تھا۔ اگرچہ تاریخ تسلسل کا نام ہے مگر ہر عہد کو اس کے اپنے زمان ومکان کے حوالے دیکھنا پڑتا ہے آج کی دنیا میں ہمیں ماضی کو نظر انداز کئے بغیر عصری واقعات سے نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ اپنے تجربے اور علم کی بنا پر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

اسی پس منظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری قوم ڈوب رہی ہے اور اس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جو تیرنا نہیں جانتے۔ تین فوجی انقلابوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مستثنیات کو چھوڑ کر، یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیسری دنیا میں جن ملکوں کو نسبتاً استحکام نصیب ہوا ہے۔ وہ

الف۔ مستحکم بادشاہوں

ب۔ انقلابی قومی تحریکوں

ج۔ سوشلسٹ انقلابوں یا

د۔ پارلیمانی جمہوریتوں

میں سے کسی ایک کے ذریعے ہی ملا ہے۔ جہاں کہیں بھی فوجی بغاوتوں کی ریت پڑی ہے، نتیجہ علیحدگی پسندی، سوشلسٹ انقلاب یا دونوں کی صورت میں نکلا ہے۔ مشرقی پاکستان ایک تازہ مثال ہے۔ افغانستان کا انقلاب بھی بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک سوشلسٹ یا ترقی پسند انقلابی تحریک کے لئے داؤد خان کی فوجی حکومت کا تختہ الٹنا، شاہ ظاہر شاہ کی مستحکم بادشاہت کا تختہ الٹنے سے زیادہ آسان تھا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر، برصغیر الگ درجہ بندی کا متقاضی ہے۔ اس کی روایت میں پنچایتی نظام جیسے قدیم جمہوری ادارے شامل ہیں۔ دوسرے برصغیر کثیر آبادی والا ایک وسیع خطہ ہے۔ تیسرے یہ کہ اشوک کے زمانے سے ہی یہاں عوامی بغاوتیں اور تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بنیادی نوعیت کے مذکورہ بالا اور دوسرے عوامل کے پیش نظر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، برطانویوں کو رفتہ رفتہ ہندوستان کے عوام کو (قسطوں میں سہی) جمہوریت کی واپسی کا عمل ۹۰ سال تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔ ان تین دھائیوں میں،

مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح جیسے قائدین نے برصغیر کے عوام کی آزادی اور خود مختاری کی زبردست جدوجہد کی قیادت کی۔ سیاسی شعور کے سیاسی بیداری کے بغیر سالٹ ٹیکس کے خلاف تحریک، تحریکِ خلافت، ہندوستان چھوڑ دو تحریک، اور راست اقدام جیسے ایجی ٹیشن ناممکن تھے۔ اور ان ہنگامہ آرائیوں کے بغیر برطانوی راج کے ستون زمین بوس نہ ہوتے۔ لاطینی امریکہ، افریقہ یا مشرقِ وسطیٰ، کسی جگہ بھی عوامی بیداری کا سبق اس قدر طویل اور اس قدر مسلسل نہیں رہا، جتنا برصغیر میں۔ برصغیر کے عوام، ہندو اور مسلمان، اپنے سویلین لیڈروں کی قیادت میں صرف نئے جھنڈے لہرانے کے لئے قربانیاں نہیں دے رہے تھے۔ وہ ان قربانیوں کا، جمہوریت اور آزادی کا مزا بھی چکھنا چاہتے تھے۔

آج کل ہمیں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ بجا، مگر یہ ملک حاصل کس نے کیا تھا؟ مسلمان عوام نے، جو قائداعظم کی سویلین قیادت میں یکجا ہو گئے تھے۔ یا جرنیلوں کے کسی ٹولے نے؟۔۔ یہ ملک مسلمان عوام کی ایک عظیم تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا، نہ کہ راتوں رات بپا ہونے والی کسی فوجی بغاوت کے نتیجے میں! یہ ملک عوام نے حاصل کیا تھا اور وہ ہی اپنے منتخب رہنماؤں کے ذریعے اسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسلام کے نام پر اسے حاصل کرنے والے ہی اپنے منتخب نمائندوں کو ہدایت کر سکتے ہیں کہ اس کے نام کی لاج کیسے رکھی جائے۔ کوئی ایک غاصب، یا غاصبوں کا کوئی ٹولہ اس کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ نہ ہی ایسے کسی فرد یا گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ طے کرے کہ یہ ملک اسلام کے مطابق چل رہا ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ اجتماعی طور پر پارلیمنٹ کے ذریعے ہو چکا ہے بندوقیں تھامے ہوئے فرد یا افراد کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام بندوق کی نالی سے نہیں نافذ ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے عوام غیر ملکی تسلط کو برداشت نہیں کریں گے اور اسی منطق کے مطابق وہ کسی اندرونی تسلط کو بھی برداشت نہیں کریں گے۔ دونوں قسم کے تسلط ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اگر عوام اندرونی تسلط کو خاموشی سے برداشت کر لیں تو پھر انھیں غیر ملکی تسلط قبول کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ غیر ملکی تسلط کی طاقت اندرونی تسلط کی طاقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر

عوام کمزور دشمن کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے ہیں تو طاقتور دشمن کے سامنے کیسے ٹھہر سکیں گے۔

اندرونی تسلط کو قبول کرنے یا برداشت کرنے کا مطلب غیر ملکی تسلط کو تسلیم کر لینا ہے۔ اس ملک کے عوام دونوں میں سے کسی تسلط کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ دونوں قسم کے تسلط کے خلاف مزاحمت کریں گے۔

پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا۔ درست' مگر اسلام صرف پاکستان ہی میں تو نہیں۔ اسلام خدائے برحق کا پوری دنیا کے لئے آخری پیغام ہے' صرف پاکستانی عوام کے لئے نہیں۔ قرآنِ پاک میں آیا ہے کہ خدا ''رب العالمین'' ہے' کائنات اور دونوں جہانوں کا رب۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ مسلمان ایشیا' افریقہ اور یورپ کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں سعودی عرب کے ایک دورے کے دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے فرمایا تھا کہ سعودی عرب' اسلام کا روحانی مرکز ہونے کے ناطے سے عالم اسلام کی قیادت کا حقدار ہے۔ بلاشبہ' سعودی عرب دُنیائے اسلام کا روحانی مرکز ہے' مگر کیا سعودی عرب میں کبھی ایسے جھگڑے کھڑے ہوئے ہیں' جیسے پاکستان میں موجودہ حکومت کھڑے کر رہی ہے۔ نہیں۔ روشن خیال سعودی شاہی خاندان کے شاہ خالد کی قیادت میں سعودی عرب بغیر ڈرامائی تنازعوں کے آگے بڑھ رہا ہے۔ تختہ اُلٹے جانے سے ایک برس قبل' مصر کے شاہ فاروق نے پاکستان کے سفیر سے کہا تھا۔ ''آزادی کے بعد' تین سال تک پاکستان کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستانی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلام بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء ہی کو وجود میں آیا تھا۔''

صد شکر کہ سابق مصری حکمران ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے کافی پہلے انتقال فرما چکے تھے۔

پاکستان کے عوام اور ان کے منتخب لیڈر مسلمان ہیں خواہ کوئی چیف الیکشن کمشنر ان کے خلاف کیسے ہی فتوے جاری کرے۔ اچھا مسلمان وہ نہیں جو جرنیلوں کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔ اچھا مسلمان وہ ہے جو ایک مجاہد کی طرح اپنے مظلوم عوام کے اقتصادی اور سیاسی حقوق کے لئے جہاد کرے۔

برصغیر لاطینی امریکہ نہیں ہے۔ لاطینی امریکہ کی تاریخی روایت' میکسیکو اور برازیل میں

بادشاہت کے مختصر تجربوں کے سوا' ایک ظالم نو آبادیاتی آمر (عموماً ہسپانوی یا پرتگالی) سے دیسی فوجی جرنیلوں کو منتقلی رہی ہے۔ میکسیکو اور کیوبا میں انقلابات برپا ہوئے۔ چلی کے پاس ایک مضبوط جمہوری روایت موجود ہے۔ مگر اکثر و بیشتر سلسلہ بیرونی نو آبادیاتی طاقتوں سے اندرونی نو آبادیاتی طاقتوں کو اقتدار کی منتقلی ہی کا رہا ہے۔

برصغیر افریقہ بھی نہیں۔ وہاں بھی' چند مستحکم بادشاہوں کے سوا' روایت برطانوی' فرانسیسی یا پرتگالی نو آبادیاتی آمریتوں سے دیسی آمریتوں کو منتقلی ہی کی رہی ہے۔ گنی' تنزانیہ اور زمبیا کے سوا نکرومہ ایسے تمام افریقی لیڈر جنھوں نے اپنی قوم کی حقیقی آزادی کی طرف رہنمائی کی' فوجی بغاوتوں کا شکار ہوئے۔ ویسے ہی جیسے برازیل کے صدر گولارٹ کا لاطینی امریکہ میں حشر ہوا۔ الجیریا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ میں یا تو مستحکم بادشاہتیں ہیں یا پھر انقلابی حکومتیں۔ شام اور عراق میں فوجی انقلابوں کی بیماری کو انقلابی بعث پارٹی کے متضاد گروپوں کے پارٹی کنٹرول نے ختم کیا ہے۔

۳......

پاکستان یا جرنیلستان

اسلامی وفاقی جمہوریہ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آئی اور فوجی انقلاب کی پہلی کوشش جنرل محمد اکبر خان نے ۱۹۵۱ء میں کی۔ دوسرا نیم فوجی انقلاب اکتوبر ۱۹۵۴ء میں برپا ہوا۔ جب غلام محمد نے خود مختار دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ یہ غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام ممکن ہی نہ ہوتا اگر اسے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کی مکمل حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اس فیصلہ کن حمایت کے بغیر غلام محمد ایسی جرأت نہ کر پاتا۔ تیسرا نیم فوجی انقلاب اکتوبر ۱۹۵۵ء میں رونما ہوا جب ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور کی مکمل نفی کرتے ہوئے صوبائی خود مختاری کا گلہ گھونٹ کر مغربی پاکستان پر ون یونٹ کو مسلط کر دیا گیا۔ یہ شرمناک حرکت انہی مجرموں کی تھی جو ایک سال قبل دستور ساز اسمبلی کے قتل کے ذمہ دار تھے۔

مگر اصل وار اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ ایوب خان کا فوجی انقلاب۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ کا انقلاب آیا اور پھر مارچ ۱۹۷۳ء میں بریگیڈیئروں نے انقلاب بپا کرنے کی کوشش کی۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو موجودہ فوجی انقلاب لایا گیا۔ یعنی پاکستان کے تیس برسوں کی تاریخ میں سکور یہ رہا ہے۔

الف۔ دو ناکام فوجی انقلاب

ب۔ دو کامیاب نیم فوجی انقلاب

ج۔ تین مکمل اور کامیاب فوجی انقلاب

اینٹی احمدی (قادیانی) تحریک کے دوران ۱۹۵۱ء میں لاہور کے مارشل لاء کو چھوڑ کر تیس سالوں میں ''خانہ جنگی'' کو روکنے کے لئے بہت ''کوششیں'' کی گئی ہیں۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ برطانوی سامراج اور ہندو غلبے سے نجات حاصل کرنے کے لئے تحریک چلانے اور اتحاد و یک جہتی کا بے مثال مظاہرہ کر کے اپنا الگ وطن حاصل کر لینے والی مسلمان قوم۔ ہر موسم خزاں میں خانہ جنگی کے دہانے پر جا کھڑی ہوتی ہو۔ اقتدار کی نہ بجھنے والی پیاس اور اختیار کی شدید بھوک کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ اس سے کبھی کبھی سوتے جاگتے میں خانہ جنگی کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔

آیئے ان فوجی انقلابوں کا ایشیا اور افریقہ کے اسی قسم کے ''انقلابوں'' سے موازنہ کریں۔ موضوع ذرا نازک ہے' اس لئے صرف ایشیا کی دو اور افریقہ کی ایک مثال دی جا رہی ہے۔

ایشیا میں۔ تھائی لینڈ کے پے در پے فوجی انقلابات نے ملک سے علیحدگی کی تحریکوں کو تقویت اور شدت بخش دی ہے۔ اگر تھائی بادشاہت ملکی اتحاد کی علامت کے طور پر موجود نہ ہوتی تو یہ ملک کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔

فلپائن میں (سول صدر کی قیادت میں) مارشل لاء نے فلپائنی صوبے منڈاناؤ میں علیحدگی کی تحریک کو شدید تر بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس ملائشیا کی کمزور اور کم سن مملکت غیر متوقع استحکام کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کا سبب جمہوریت ہے۔

''عظیم اور پیارے ہمسائے'' بھارت کی ہی مثال لے لیں۔ اگر بھارت کو پاکستان کی طرح یکے بعد دیگرے فوجی انقلابات کی بیماری لاحق ہوتی تو اب تک یہ تین یا چار الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ بھارت پاکستان سے زیادہ مختلف الہیت ملک ہے۔ مگر اسے متحد اور

ہنگامے یا انتشار سے بچائے رکھنے کا سہرا جمہوریت کے سر ہے۔

افریقہ سے صرف تازہ ترین (فوجی) انقلاب کی مثال دی جاتی ہے اگر موریطانیہ کا حالیہ فوجی انقلاب اسی نسل کا واقعہ ہے تو یہ لازماً اسلامی جمہوریہ موریطانیہ کے ٹوٹنے پر منتج ہوگا۔ اور یہ دوسری اسلامی جمہوریہ ہوگی جو فوجی انقلابات کی بھینٹ چڑھے گی۔

پاکستان...... پاک لوگوں کا ملک...... جرنیلستان بن چکا ہے...... فوجی انقلابوں کی سرزمین۔

پاکستان میں سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے جرنیل ہر مرتبہ ''خانہ جنگی'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ تاہم جب یہ سازش ناکام ہو جائے تو وہ خانہ جنگی کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ۱۹۵۱ء میں جب وزیراعظم لیاقت علی کی حکومت، نے چیف آف آرمی اسٹاف میجر جنرل اکبر خان کے فوجی انقلاب کی کوشش ناکام بنادی تھی تو انھوں نے فوجی سازشوں کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی تھی۔ انھوں نے سازشیوں کو ملک وقوم اور جمہوریت کے دشمن قرار دیا تھا۔ انھوں نے جرنیلوں کو تنبیہہ کی تھی کہ وہ سیاست میں حصہ لینے سے باز رہیں کیونکہ اسی میں پاکستان کا مفاد ہے۔ انھوں نے سازش میں شریک فوجی افسروں کو خودغرض افراد قرار دیا۔ سو یہ فوجی انقلاب ناکام ہوا اور خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ اگر سازشی کامیاب ہو جاتے تو وہ خود کو پاکستان کا نجات دہندہ قرار دیتے۔ جنھوں نے ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے بہت ہچکچاتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔

۱۹۷۲ء کے آخر اور ۱۹۷۳ء کے آغاز میں، یعنی مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہونے والی المناک خانہ جنگی کے خاتمہ سے بمشکل ایک سال بعد ہی' ایک اور فوجی انقلاب پرورش پا رہا تھا۔ تمام سازشی انقلاب شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ انقلاب کچھ زیادہ ہی شخصی تھا۔ چیف آرمی اسٹاف جنرل ٹکا خان نے مجھے رشتہ داریوں کا خود ان کے سیاسی حلیف کے بیانات نے خفیہ ایجنسیوں کی سازشیوں ایک چارٹ دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ انقلاب کی یہ کوشش بنیادی طور

پر آپس میں رشتہ دار افسروں کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس سازش کے بنیادی کردار آپس میں رشتہ داریاں رکھنے والے چند افسر، ان کے دوست اور ان کا سیاسی عزیز تھا جو خود فوج کا ایک سابق اعلیٰ افسر تھا۔ اس ممکنہ فوجی انقلاب کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ سازشیوں نے اپنا آدھا وقت انقلاب برپا کرنے کی وجوہات تلاش کرنے میں صرف کیا اور کے ٹھکانے کی طرف رہنمائی کی۔ سازشیوں کے مقدمے کی سماعت ان کے اپنے ساتھی افسروں نے کی۔ جنرل ضیاء الحق عدالت کے پریذائڈنگ افسر تھے۔ جب یہ مقدمہ ختم ہوا تو میں نے جنرل ضیاء الحق کو راولپنڈی طلب کر کے ان کے تاثرات پوچھے۔ انھوں نے سازش کے اسباب اور محرکات کا ایک تفصیلی تجزیہ پیش کیا جو بات مجھے سب سے نمایاں نظر آئی وہ ان افسروں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خودغرضی تھی۔ ان کی سرگرمیوں اور منصوبے میں کسی معروضے یا ٹھوس سبب کا شائبۂ ڈھکولا تک نہ تھا۔ اور سب سے افسوس ناک امر یہ تھا کہ یہ سازش ۱۹۷۱ء کے المیے اور پاکستان ٹوٹنے کے فوری بعد تیار کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوجی حکومت نے نتیجے میں رونما ہونے والے تاریخی المیوں سے اقتدار کی خواہش میں اندھے افراد نے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ خون کے دریا ان کے لئے پانی کے مترادف تھے۔ فوجی حکمرانوں کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں میں فاش غلطیوں نے ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ سیاست میں ملوث ہونے کے نتیجے میں فوج میں جو کرپشن ہوئی تھی اس سے کوئی شرمسار نہیں۔ مشرقی پاکستان کے المیے اور ۹۰,۰۰۰ فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی ذلت نے ان بدمست افسروں پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔

اب میں فوج اور سول اداروں کے باہمی تعلقات کی طرف آتا ہوں۔ میں آزادی سے اب تک کی تاریخ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا نہ ہی وہ سب کچھ دہرانا چاہتا ہوں، جو میں سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے خلاف آئینی درخواست کی سماعت کے دوران اپنے حلفیہ بیان میں کہہ چکا ہوں۔ میں لاہور ہائی کورٹ میں مارشل لاء ضابطہ ۱۲ کے تحت اپنی نظر بندی سے متعلق اپنے (تاحال) سنسر شدہ بیان کو بھی نہیں دہراؤں گا اور نہ ہی بعد کے واقعات کو، جو میرے خدشات کے عین مطابق رونما ہوئے۔ ہماری تاریخ کے تینوں مارشل لاء عوام کے سامنے ایک

آئینے کی طرح ہیں۔ بے تحاشا میک اپ کی وجہ سے عوام پہلے مارشل لاء کا اصل چہرہ صاف طور پر نہ دیکھ سکے تھے۔ تاہم دوسرے مارشل لاء کا ''ایلزبتھ آرڈن مارکہ'' میک اپ برہمن پترا کے پانی نے دھوڈالا۔ موجودہ مارشل لاء کی جھوٹی وگ اور مصنوعی دانت بھی اتر چکے ہیں اور عوام آئینے میں اس کی مکروہ شکل کو عریاں دیکھ رہے ہیں۔ جب تباہی سر پر ہوتو وہ دلائل کا وقت نہیں ہوتا۔ حالت بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اگر ابھی پانی سر سے اونچا نہیں گذرا تو بس گذرنے ہی والا ہے جو کوئی اس اخلاقی اور روحانی تقسیم کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا پا رہا وہ احمقوں کی جنت میں بس رہا ہے۔ میں وحدت یا کثرت، سیکولرازم یا کٹھ ملائیت، جمہوریت یا آمریت کی بحث کو مختصر کرتا ہوں۔

ابتدا میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کے کوئٹہ ایئر پورٹ کے بیان سے کرتا ہوں۔ جنرل ضیاء الحق فرماتے ہیں، مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ ملک میں تین طاقتیں ہیں، عوامی لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی اور فوج اور انھوں نے بقیہ دو کا خاتمہ کر کے اکیلی طاقت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ میں اس بیان کے پہلے حصے کو تسلیم کرتا ہوں۔ اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ابھرنے والی معروضی حقیقت یہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی غالب سیاسی قوتوں کے طور پر ابھری تھیں۔ تیسری قوت فوج تھی۔ فوج ۱۹۵۴ء سے کھلے طور پر سیاسی قوت بن کر سامنے آنے لگی تھی۔ تب سے اس کا سیاسی کردار وسیع تر ہوتا رہا تھا۔ کسی موقع پر بھی یہ کردار سکڑا نہیں تھا۔ ۱۹۶۹ء میں، مارشل لاء کی شکل میں، فوج پاکستان کی حکمران تھی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات فوج کے فراہم کردہ لیگل فریم ورک آرڈی ننس کے تحت منعقد ہوئے تھے۔ فوج گردن تک سیاست میں دھنسی ہوئی تھی۔ یہ ایک ناخوشگوار اور تکلیف دہ حقیقت تھی۔ مگر بہر حال حقیقت حقیقت ہوتی ہے۔

پاکستان میں واقعی تین طاقتیں تھیں۔ عوامی لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی اور فوج۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو سیاست میں حصہ لینے کا پورا پورا حق تھا۔ مگر فوج سیاسی میدان میں ایک زبردست غاصب کے طور پر گھسی ہوئی تھی۔ جنرل کے بیان کا دوسرا حصہ ناقابلِ فہم اور متضاد ہے۔ اب تک ہم ان کے ''حکمت کے موتیوں'' کے کافی عادی ہو چکے ہیں۔ بھلا میں کیسے ان دو طاقتوں

کوختم کر کے ایک کو برقرار رکھنا چاہتا تھا؟ اگر یہی نتیجہ اخذ کرنا ہے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ فوج کو عوامی لیگ کے چھ نکات تسلیم کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔ اگر $5\frac{1}{2}$ سال تک پاکستان کی مسلح افواج کے لئے نمایاں خدمات کے عوض چیف آف آرمی اسٹاف نے یہی انعام دینا ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مہربانی کو معاف کرنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ میں نے فوج کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ کیا نوے ہزار (90,000) فوجی قیدیوں کو واپس لا کر میں نے فوج کو تباہ کرنا چاہا تھا؟ کیا جنرل ضیاء الحق نے امریکی اسلحے کی ترسیل پر سے دس سال پرانی پابندی ختم کرائی تھی۔ کیا چین سے ہتھیار بھی اس نے حاصل کئے تھے؟ اسلحے کی تیاری' نیوی کی ترقی' ایئرفورس کے لئے جنگی طیارے اور افواج کے لئے میزائلوں کے حصول کے لئے نصف بلین ڈالر اس نے خرچ کئے تھے؟ دفاعی سروسوں کی تنظیم نو کس نے کی تھی؟ دفاعی پیداوار کی وزارت کس نے قائم کی تھی؟ اسلامی ممالک کے ساتھ دفاعی تعاون کا منصوبہ کس کا تھا؟ ایٹمی پلانٹ کیا جنرل ضیاء کا نجی پلانٹ تھا؟ اور اگر میں نے واقعی فوج کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی تھی تو اس نے $5\frac{1}{2}$ سال میرے ماتحت اور اپریل ۱۹۷۶ء میں سٹاف کالج کوئٹہ میں میرے اعزاز میں دیئے گئے عشائیہ میں یہ الفاظ کیوں کہے۔

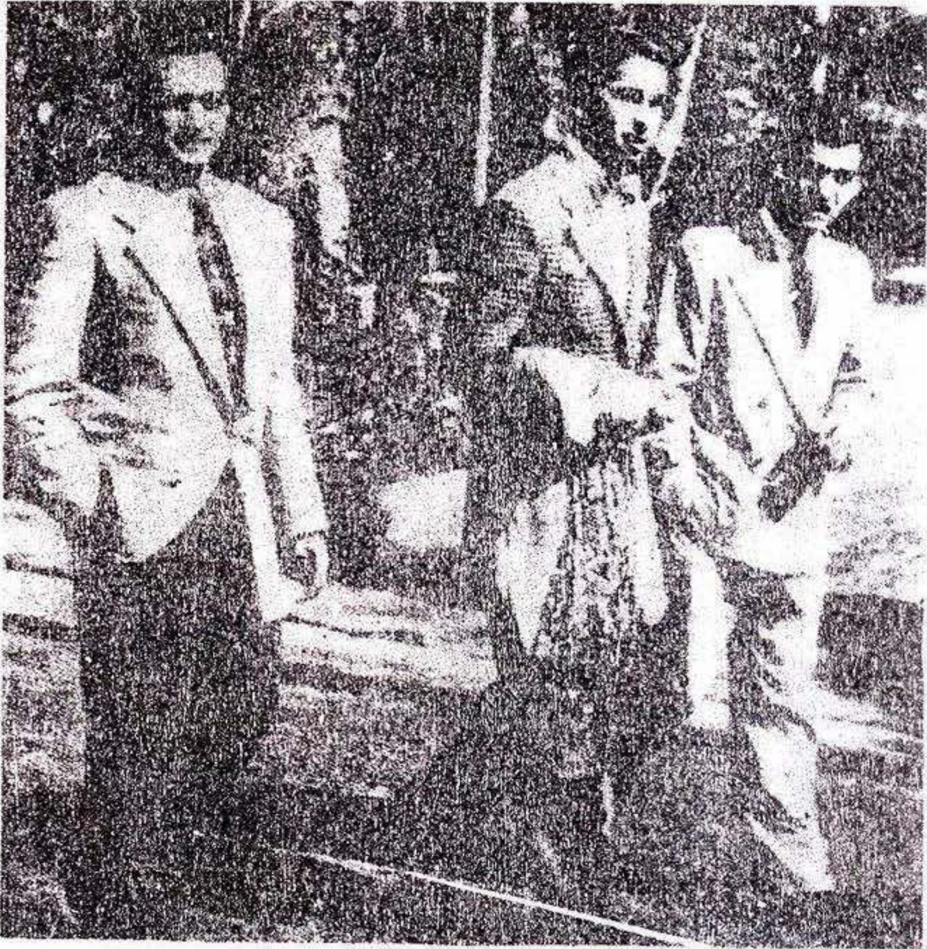
''ہم میں جو لوگ حقائق اور اعداد وشمار سے واقف ہیں'
اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد
پاکستانی افواج کو جو توجہ ملی ہے اس سے پہلے ساری تاریخ میں
کبھی نہیں ملی۔ میرے اور افواج پاکستان کے پاس اس کے
صلے میں دینے کے لئے کچھ نہیں۔ مگر میں امید رکھتا ہوں کہ
خدا کے فضل وکرم سے ایک روز آپ کے ہوتے ہوئے'
پاکستانی فوج اس توجہ اور محبت کا صلہ دے سکے گی اور ثابت
کرے گی کہ آپ کی محنت اور مہربانی بے کار نہیں گئی۔''

مجھے ''ایسے زبردست خراج تحسین'' وہ فوج کے چیف آف اسٹاف بننے سے قبل اور اس

کے بعد پیش کرتے رہے ہیں: جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد بھی موصوف نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

انھوں نے ہی تجویز پیش کی تھی کہ میں بکتر بند کور کا کرنل۔ان۔ چیف بن جاؤں۔ کھاریاں کی مسند نشینی کی تقریب میں اپنی تقریر میں انھوں نے قصیدہ خوانوں کو مات کر دیا تھا۔

اگر میں درحقیقت فوج کا دشمن تھا اور اسے تباہ کر دینے پر تُلا ہوا تھا تو ''اسلام کا ایک سپاہی'' میرے مذموم ارادوں سے اتنی دیر تک بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ ہی ایک ''مردِ مومن'' میرے عظیم سپریم کمانڈر ہونے پر مجھے اس قدر فراخ دلی سے خراج تحسین پیش کر سکتا تھا' اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں تو فوج کا دشمن ہوں۔



۴......

تباہی کے دہانے پر

ماضی میں جدوجہد کے فیصلے میدانِ جنگ میں ہوا کرتے تھے اب یہ لڑائیاں پارلیمنٹ میں لڑی جاتی ہیں۔ ۶۱-۱۹۶۰ء کے موسم سرما میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کے وزیرخارجہ وان برینتانو پاکستان کے دورے پر تشریف لائے اس وقت کے وزیرخارجہ منظور قادر اور مجھے ان کی صدر ایوب سے ملاقات کے دوران موجود رہنے کو کہا گیا۔ اکثر امور پر اتفاق رائے پایا گیا۔ صدر ایوب کے الوداعی کلمات یہ تھے۔ ''پاکستان بھی جرمنی جیسی روایات کا مالک ہے۔'' وان برینتانو جو اطالوی پس منظر رکھنے والے جرمن ارسٹوکریٹ تھے اور شاید دونوں ملکوں کی مشترک اقدار اور روایات سے واقف نہ تھے کہنے لگے ''میرے لئے یہ ایک دلچسپ اطلاع ہے۔'' صدر ایوب نے یہی فقرہ بون میں چانسلر کونارڈ ایڈناور اور وزیرخارجہ شرائنڈر سے بھی دہرایا۔ لاہور میں سمندر پار ممالک سے متعلق اقتصادی امور کے جرمن وزیر مسٹر والٹر شیل (جواب جرمنی کے صدر ہیں) سے بھی انھوں نے یہی بات کہی۔ ایوب خان کوئی عام آدمی نہ تھا۔ وہ نو دس سال تک پاکستان کی افواج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ کیا سبب تھا جس کے باعث وہ سمجھتا تھا کہ یہ مشابہت اس قدر اہم ہے کہ ہر جرمن رہنما سے اس کا تذکرہ کیا جائے؟

نپولین بوناپارٹ سے پیچھا چھڑا لینے کے بعد، یورپ کے شہنشاہ اور بادشاہ آسٹروی، ہنگرین ریاست کے دارالحکومت وی آیانا میں جمع ہوئے تاکہ یورپ میں امن واستحکام کے ایک معاہدے پر دستخط کرسکیں۔ یہ ارسٹو کریٹوں (اشرافیہ) کا عہد تھا۔ یہ طبقہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس سے جانبر ہو چکا تھا، اور واٹرلو میں نپولین کو بھی شکست دے چکا تھا۔ اس امر پر یقین پختہ ہونے کے بعد کہ تاریخ نے یورپ کے ''خالص خون'' کو ابدی حکمرانی کے لئے چن لیا ہے۔ انھوں نے ''سٹیٹس کو'' کی تشکیل دے دی۔ آسٹریا کا شہزادہ میٹرنک اس معاہدے کا روحِ رواں تھا۔ فرانس کے ٹیلی رینڈ کی بے مثال ذہانت اور برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کاسٹرلی سے مل کر اپنے لئے بہترین شرائط منوانے کی کوششوں کے باوجود شہزادہ میٹرنک نے ستمبر ۱۸۱۵ء میں ایک عظیم الشان تقریب میں یورپ کے نئے نظام کو نافذ کر ہی دیا۔

وی آنا کی کانگریس میں میثاق وی آنا طے پایا تھا۔ جس میں بادشاہ کو ریاست قرار دیتے ہوئے، اشرافیہ کو خصوصی مراعات اور وسائل دیئے گئے تھے۔ یہ آمریت اور جاگیرداری کا ایک آمیزہ تھا جس پر نومولود سرمایہ داری کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔

عوام کا نمبر سب سے آخری تھا اور وہ اشرافیہ اور کلیسائیت دونوں کے ظلم کا نشانہ تھے۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۱۵ء کو روس، جرمنی اور آسٹریا نے 'مقدس اتحاد' پر دستخط کئے۔ مگر ۱۵ برس کے اندر اندر عوام پھر باہر نکل آئے تھے۔ ۱۸۴۸ء تک مشرقی یورپ کی تقریباً تمام اقوام بغاوت علم بلند کر رہی تھیں۔ انقلاب کی آمد آمد تھی۔ مازینی اور لوئی کوسوتھ جیسے رہنما عوام کی رہنمائی اور ولولہ انگیزی کے لئے سامنے آ چکے تھے۔ وی آنا میں بہت احتیاط سے طے پانے والا سمجھوتہ مٹی میں مل چکا تھا۔ اور اس کا معمار شہزادہ میٹرنک لندن کو فرار۔ بعد ازاں بنجمن ڈزرائیلی نے اپنی بیوی اور داشتہ کو اطلاع دی تھی کہ میٹرنک سراسر بور آدمی ہے۔

یورپ کے انقلابات کے بھنور میں پھنسے ہوئے جرمن امیرزادوں نے اپنی فوجوں کی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جرمن فوج جرمنی کے وسائل سے کہیں زیادہ پھیل چکی تھی۔ یہ واضح تھا کہ جرمنی کا رقبہ اور وسائل اس فوج کا بوجھ زیادہ دیر تک نہیں اٹھا

سکیں گے۔ صورت حال اس قدر بگڑ گئی کہ یہ کہا جانے لگا ''جرمنی ایک فوج ہے جس کے پاس ایک ملک ہے' نہ کہ ایک ۔ ملک جس کے پاس فوج۔''

جرمن امیر زادے نتائج سے بخوبی آ گاہ تھے۔ ان کے سامنے تین متبادل تھے۔

(i) جرمنی کی سلطنت وسیع کر دی جائے اور جرمن مادرِ وطن اس سلطنت کا مرکز ہو۔

یا (ii) اس سفید ہاتھی فوج میں کمی کی جائے۔

یا (iii) جرمن سلطنت اپنی ہی فوج کے بوجھ تلے پس کر رہ جائے۔

جرمن سلطنت نے اس مسئلے کا حل تین توسیع پسندانہ جنگوں میں تلاش کیا۔ پہلی جنگ ۱۸۶۴ء میں ڈنمارک کے خلاف لڑی گئی۔ دوسری جنگ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے خلاف اور تیسری ۷۱-۱۸۷۰ء میں فرانس کے خلاف۔ ان جنگوں کی منصوبہ بندی شہزادہ اوٹو وان بسمارک نے کی اور ان پر عمل درآمد غیر معمولی ذہانت کے مالک جنرل وان موٹکے نے۔ فرانس سے جنگ کے خاتمے پر جرمنی کے ''اتحاد'' کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ یقیناً جرمن سلطنت نے اپنی فوج کے ذریعے اپنے فوجی بجٹ کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ ۱۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو فتح کے نشے میں سرشار بسمارک نے جنرل وان موٹکے اور دوسرے سیاست دانوں اور جرنیلوں کی معیت میں ایک عظیم الشان تقریب میں اعلان کیا۔ ''اے سلطنت' اے سیرز' کام مکمل ہو چکا ہے''۔

پاکستان بھی جرمن سلطنت کی طرح ایک بہت بڑی باقاعدہ فوج کا مالک ہے۔ پاکستان نے بھی تین جنگیں لڑیں ہیں۔ یہ جنگیں قریباً ۸۰ سال بعد لڑی گئیں۔ ۱۹۴۸ء' ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں۔ اور وہ عظیم الشان تقریب ڈھاکہ ریس کورس میں ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو منعقد ہوئی جس میں جنرل ٹائیگر نیازی نے شرکت فرمائی۔ جنرل وان موٹکے کی تقریب کے ایک صدی بعد...... ''کام مکمل ہو گیا ہے۔''

ایوب خان نے غلط تو نہ کہا تھا۔

قومی مفادات کے تقاضے ذاتی اغراض کی تشہیر سے پورے نہیں ہوتے میں نے ہمیشہ عظیم قومی مفادات کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ میں نے مسلح افواج کے وقار اور شہرت کو بچانے کے

لئے مشکلات بھی جھیلیں ہیں۔ اب بھی میں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ (۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں) پر کھلے بندوں تبصرہ کرنے سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ اس سے مسلح افواج کے نام کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ سنگین اشتعال انگیزیوں اور غیر انسانی سلوک کے باوجود میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ وائٹ پیپر میں حمودالرحمٰن رپورٹ کے بارے میں دو جگہ نمایاں حوالے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح نیکی کو بدی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس رپورٹ میں یحییٰ خان اور اس کے ٹولے کی گھناؤنی سازش کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ بنگال کا نقشہ سرخ رنگ میں رنگا گیا۔ اس جنرل کی ہدایت پر، جس کی جان اور عزت میں نے بچائی مگر جو جام صادق علی کو میرے خلاف قتل کے مقدمے میں وعدہ معاف گواہ بننے پر آمادہ کرنے کے لئے لندن تک گیا۔ وائٹ پیپر کے صفحہ نمبر ۱۰۶ پر کہا گیا ہے کہ اس مسئلے پر عوام میں شور شرابے سے مجبور ہو کر میں رپورٹ شائع کرنے پر غور کر رہا تھا مگر مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ اس بارے میں کوئی یکطرفہ فیصلہ کرنے سے پہلے مزید سوچ بچار کر لوں۔ وائٹ پیپر کا یہ پیرا نمایاں طریقے سے شائع کیا گیا ہے اور یوں ہے:

> ''بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس سے قبل کے واقعات کو جو حمودالرحمٰن رپورٹ کے دائرہ کار سے باہر ہیں، تشہیر سے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے اور رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ اور بھی زور پکڑ جائے گا اور منفی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لئے وزیراعظم سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلے پر نظر ثانی فرمائیں۔''

صفحہ ۱۰۷ پر کہا گیا ہے:

> ''دوسرا گرما گرم موضوع ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس سے پہلے کے واقعات'' کا تھا۔ طے یہ ہوا کہ حمودالرحمٰن رپورٹ سے باہر کوئی نئی توضیح نئے مسائل کو جنم دے گی، رپورٹ کی

اشاعت کے مطالبے کو تقویت بخشے گی اور منفی نتائج کی حامل
ہوگی۔ جناب بھٹو نے اس لائحہ عمل سے اتفاق کیا اور مختصراً اتنا
کہا۔ ''ہاں' اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔''

صفحہ ۱۰۷ کا پیراگراف اس سے پہلے والے حوالے ہی کی تکرار ہے۔ مگر اس میں سفارش سے میرے اتفاق کا ذکر بھی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلح افواج کی عزت کے تحفظ کے لئے ہی میں نے اپنے سیاسی مفادات کی قربانی دی تھی۔ اور اس کا کیا خوب صلہ مل رہا ہے۔ بجائے میرا شکر گذار ہونے کے' نیکی برباد گناہ لازم کی اذیت پسندانہ کوشش کی جارہی ہے یہ ہے۔ ''اِدھر ہم' اُدھر تم'' کا اصل مطلب' وہ فقرہ جو اس مسخ شدہ شکل میں میں نے کبھی استعمال نہیں کیا' مگر جو بہر حال سچ ثابت ہوا۔ اُدھر بنگالیوں کی شامت آئی اور اِدھر ہماری...... اُدھر بنگالی سیاست دانوں کو حکمرانی کے لئے نااہل سمجھا گیا اِدھر ہمیں۔ اُدھر بھی جمہوریت ناقابلِ عمل تھی' اِدھر بھی جمہوریت ناقابلِ عمل قرار پائی۔ اُدھر بھی سرمایہ دار عوام کا استحصال کرتے رہے' اِدھر بھی یہی حال رہا۔ اُدھر بھی بنگالیوں کو اقتدارِ اعلیٰ کی بجائے ڈنڈا ملا اور اِدھر بھی ڈنڈا ہمارا مقدر ٹھہرا۔ یعنی اِدھر ہم' اُدھر تم۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کوئٹہ ایئر پورٹ پر میرے دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں سامنے آنے والی تین قوتوں والے بیان کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر میں پہلے بھی تبصرہ کر چکا ہوں۔ اگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میری ان تنبیہوں کا حوالہ دینے کی تکلیف فرماتے جو میں نے پاکستان کی سیاست میں فوج کے کردار کے بارے میں دی تھیں' تو یہ موجودہ بحران سے زیادہ متعلق ہوتا۔ جنرل ضیاء الحق کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا:

''اس بحران کا ناگزیر سبق یہ ہے کہ عوام کو حکومت میں
شرکت کا موقع دیا جائے۔ اس وقت جبکہ مشرقی پاکستان میں
فوجی کارروائی جاری ہے' مغربی پاکستان میں مایوسی بڑھ رہی
ہے اور موجودہ فوجی حکومت اب اس بحران کو نظر انداز کر کے
اپنے فوجی۔ افسر شاہانہ اقتدار کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ صرف ایک

حقیقی نمائندہ حکومت، جسے عوام کا مکمل اعتماد اور تعاون حاصل ہو، ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کا ایمان ہے کہ عوام کی نمائندہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ فرض بھی ہے کہ عوامی نمائندوں کو فوری انتقال اقتدار کا مطالبہ کرے۔ اگر فوجی حکومت سے اقتدار کی منتقلی میں تاخیر ہوئی، تو چند ماہ میں ہی ملک ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوگی۔" (عظیم المیہ)

جنرل کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر بھٹو نے کہا تھا:

"یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر اس سال کے اندر اندر جمہوریت بحال نہیں کی جاتی تو پھر پاکستان کو بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت اس بحران سے نہیں نمٹ سکتی۔

اے پاکستان کے عوام! ظلم اور غیر یقینی کی اس طویل رات کو ختم کرنے کے لئے میدان میں آ جاؤ۔ اب جرنیلوں کا دور ختم ہونا چاہیے اور پاکستان کے عوام کو ہر قیمت پر اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔"

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ مسٹر بھٹو نے کہا تھا:

"ہمیں ناقابلِ معافی غلطیوں کی ایک تکلیف دہ وراثت ملی ہے۔ ہمیں پرانے پاپیوں کے گناہوں کی صفائی دینے کے لئے کہا جاتا ہے۔ سیاست کی ابجد سے بھی ناواقف سطحی ذہن تاریخ کا مزاج سمجھے بغیر بنیادی اہمیت کے سیاسی فیصلے کرتے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج

پاکستان تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔" (عظیم المیہ)

یہ تھیں ۱۹۷۰۔۷۱ء کی تلخ حقیقتیں جن کی پیش گوئی میں نے کی تھی۔ عوام کے منتخب رہنما کے طور پر یہ میرا فرض تھا کہ پاکستان کے عوام کو آنے والی تباہی سے خبردار کروں۔ یحییٰ خان کی جنتا نے میری بار بار کی تنبیہوں پر کوئی کان نہ دھرا اور بالآخر ہم تباہی سے دوچار ہوئے۔

آٹھ برس گزر چکے ہیں اور آج ایک بالکل مختلف صورتحال درپیش ہے۔ بحران ۱۹۷۰۔۷۱ء سے کہیں زیادہ سنگین اور گہرا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں خطرہ مشرقی پاکستان کھونے کا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں خطرہ بچے کھچے پاکستان سے بھی ہاتھ دھونے کا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں منظر پر تین طاقتیں تھیں۔ ۱۹۷۸ء میں صرف دو، یعنی فوج اور پیپلز پارٹی۔ ۱۹۷۰ء کے زخموں کے مرہم غائب ہو چکے ہیں۔ عوام اور فوج کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ سوال واضح ہے۔ پاکستان کی حاکمیت کس کا حق ہے، عوام کا یا فوج کا۔ ہمارے معاشرے کا نظم و نسق کون چلائے گا، پارلیمنٹ یا جرنیل۔ عوام کو خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں۔ حالات لازماً حتمی تصادم کی طرف لئے جارہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ انتہائی خوفناک ہوگا۔

اسپین میں بھی ایسا ہی تضاد تھا۔ پچاس برس سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ مگر اس دور کی تلخ یادیں آج بھی ہسپانوی عوام کے ذہنوں میں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تازہ ہیں۔ اسپین ان شدید زخموں کی وجہ سے آج بھی مفلوج ہے۔ اسی طرح، مغربی مؤرخین کے پروپیگنڈے کے برعکس، اسپین میں اسلام کے جڑ سے اکھڑنے کے ذمہ دار فرڈیننڈ اور ازابیلا نہیں تھے بلکہ المیہ غرناطہ کا باعث مسلم دمشق کا مسلم قرطبہ سے حسد اور فریب کاری تھی۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا تو صرف چیف الیکشن کمشنر تھے۔ جیسے مولوی اور اس کا جان۔ اسپین کی مثال میں ہمارے لئے دو سبق ہیں۔ ایک فوج اور عوام میں خطرناک تصادم کا اور دوسرا ایک اسلامی ریاست کے خاتمے کا۔ ہسپانوی کہتے ہیں۔ "ٹوڈو پورلا پاتیا" پاکستانی کہتے ہیں۔ "پاکستان زندہ باد"۔ باسک اسپین کا بلوچستان ہے اور اندلسیہ پاکستان کا سندھ۔

کیتھولک ازم کو اسپین کے تمام مسائل کا حل بتایا جاتا تھا۔ اب پاکستان کے پاس بھی تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ اگر اس بارے میں شبہ ہو تو میڈم رانی کے گرائیں افضل چیمہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر اسلام کو بھارت سے اکھاڑ پھینکا گیا تو وہ کہیں اور پھل پھول لے گا مگر ہندو مت اکھڑا تو کہیں نہ پھول سکے گا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مت کو بچانے کے لئے اسلام کو اکھاڑ پھینکو۔ کیا اب مہاتما کے ارشاد کو سچا ثابت کرنے کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔

حال ہی میں شیخ عبداللہ کے کشمیر کے متعدد قصبوں میں مسلمانوں کا خون بہایا گیا ہے۔ جنرل کو جھوٹے غرور اور حماقتوں سے باز آ کر سوچنا چاہیے کہ متبادل تیزی سے کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ یا یہاں ایک اور غرناطہ بنے گا اور یا ایک اور کربلا...... میں پاکستان کا واحد لیڈر رہوں جو اس تصادم کو روک سکتا ہے اور ایسی جدوجہد میں جان سے گذرنا ایک قابل فخر موت ہو گی...... ملک کو حتمی تباہی سے بچانے کے لئے میں خوشی سے زندگی قربان کر دوں گا۔

میں ایک قوم کی تعمیر، عوام کی خدمت اور تباہی کو ختم کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ ایک گھٹیا، وحشی اور کمینی فوجی جنتا کے ہاتھوں بے عزت ہونے کے لئے نہیں۔ قوموں کی زندگی میں ''بیستل'' پر ہلہ بولنے کا لمحہ ایک نہ ایک دن آ ہی جاتا ہے۔ فرانس والوں نے فوج اور اقتدار کی اس قابلِ نفرت علامت پر ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء میں حملہ کیا تھا۔ پاکستان کے عوام اگر ۱۹۷۸ء میں نہیں تو ۱۹۸۹ میں سہی، اپنے ''بیتل'' پر ہلہ ضرور بولیں گے۔ وہ دن آ کر رہے گا، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں۔ واحد حل یہی ہے۔

ملک آئین چاہتا ہے،
قوم جمہوریت چاہتی ہے،
عوام پارلیمنٹ چاہتے ہیں،
محنت کش پاکستان پیپلز پارٹی چاہتے ہیں۔

کچھ سمجھے؟ عوام یہ سب چاہتے ہیں۔ اب امام مہدی بننے کی کوشش چھوڑ دو اور دفع ہو جاؤ۔

5......

خفیہ اداروں کے کرتب

حال ہی میں مجھے ایچ ۔ آر ۔ ہیلڈ مین کی کتاب ''اقتدار کی منزلیں'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں بصد معذرت ایک بڑی طاقت کے ساتھ موازنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ چونکہ میں ایک یہی موازنہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا' لہٰذا پہلے ہی سے معذرت کر لی ہے۔ ہیلڈ مین صدر رچرڈ نکسن کا رفیع رضا تھا۔ ''اقتدار کی منزلیں'' میں ہیلڈ مین اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ صدر نکسن کے زوال میں سی آئی اے کا کردار شبے سے بالاتر نہیں ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ابتدائی مقصد صرف انھیں بے دست و پا کرنا ہو۔ کتاب کے صفحہ ۲۷ پر ہیلڈ مین کہتا ہے:

''اس مرتبہ سی آئی اے تیار تھی۔ درحقیقت بہت ہی تیار۔ وہ اس کھیل میں کئی مہینے آگے تھے۔ اور آج مجھے یقین ہے کہ نکسن جس جال میں پھنسے تھے' وہ سی آئی اے ہی کا پھیلایا ہوا تھا۔''

ذیل کے اقتباسات یہ ثابت کریں گے کہ یہ موازنہ بے سبب نہیں۔ مشابہت اس قدر ہے کہ میں ششدر رہ گیا تھا۔

(1) ''نکسن اپنے وزیروں کے استعفےٰ کا مطالبہ کر رہے تھے تا کہ

ان کی جگہ نسبتاً مضبوط افراد کو آگے لایا جا سکے۔ درحقیقت ان میں سے چار کی وہ ازسرِ نو تقرری کا ارادہ رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ، وہ حکومت کے ڈھانچے میں بعض ڈرامائی بلکہ انقلابی تبدیلیاں لانے والے تھے۔"

(2) "اپنے پہلے دور میں نکسن نے اس انقلاب کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک تنظیمِ نو کا بل پیش کیا تھا۔ کانگریس نے بوکھلاہٹ اور جلد بازی سے اس بل کو مسترد کر دیا۔ وائٹ ہاؤس کے مٹھی بھر معاونین کے ہاتھ میں طاقت مرتکز ہونے کے خدشات سے کانگریس میں ہراس پھیل گیا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ نکسن نے غصے میں آ کر اعلان کیا کہ اگر وہ انتخاب دوبارہ جیت گئے تو وہ صدارتی حکم کے ذریعے تنظیمِ نو کر دیں گے۔ کانگریس جائے بھاڑ میں۔

وہ انتخاب جیت گئے اور انھوں نے اپنے اس اعلان پر عمل بھی کیا۔

(3) "نکسن راضی ہو گئے۔ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہم گھر کی صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ اب وقت ہے کہ نئی ٹیم کو موقع دیا جائے۔ وقت؟ میں کہوں گا کہ ہم نے پہلے ایسا نہیں کیا مگر اب ہمارے پاس عوام کی تازہ تائید موجود ہے اور ان سے ہمارا ایک وعدہ۔ اس صفائی کے بارے میں بھی ہے، جو ہم نے ۶۸ء میں نہیں کی تھی۔"

(4) "جنوری ۱۹۷۳ء میں 'یو۔ ایس۔ نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ' میں نکسن کی تنظیمِ نو کا پس منظر کے عنوان سے کہا گیا۔

"صدر جس طرح عہدوں اور ذمہ داریوں میں ردوبدل کر رہے ہیں، لوگ اسے 'انتظامی انقلاب' کا نام دیتے ہیں۔ صدر کا مقصد! حکومت کو اس طریقے سے چلنے پر مجبور کرنا، جس طرح وہ خود چاہتے ہیں۔ اعلیٰ انتظامی عہدوں میں ان مسلسل تبدیلیوں سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں

کہ صدارت کے دوسرے دور میں نکسن نے امریکہ کی عظیم وفاقی انتظامیہ کو نکیل ڈال دی ہے۔ اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ وائٹ ہاؤس کے اہم ترین شعبوں کے نگران معاونین کے طور پر اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کا تقرر ہے۔"

یہ مضمون یکم جنوری ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ چند ہفتے بعد' اور ''پوسٹ'' اور ''ٹائمز'' کی واٹر گیٹ کے بارے میں نت نئی کہانیوں کے کئی ماہ بعد' گیلپ پول نے انکشاف کیا کہ نکسن کی مقبولیت (یا قبولیت) پرانے سب ریکارڈ توڑ چکی ہے۔

''واٹر گیٹ کی نقب زنی اور اس سے متعلق وڈورڈ اور برنسٹائن کے انکشافات عوام میں ہلچل پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اور اب نکسن جیسا صدر' جس سے ڈیموکریٹ اور افسر شاہی اتنے خوفزدہ تھے جتنا وہ اس صدی کے کسی صدر سے نہیں رہے تھے' حکومت پر آہنی گرفت رکھتے ہوئے اپنے اقتدار کے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

اگر نکسن کا تنظیمِ نو کا خواب پورا ہو جاتا' اور وہ صدر رہتے تو کیا ہوتا؟ اس خیال سے واشنگٹن کانپ جاتا ہے نہ صرف وہ اپنے وائٹ ہاؤس کے آٹھ اعلیٰ افسروں کے ذریعے حکومت کی باگ ڈور پر پوری طرح حاوی ہو جاتا بلکہ ہر سرکاری ایجنسی کی اہم پوزیشنوں میں اپنے 'ایجنٹ' داخل کر دیتا۔

نکسن کے خوفزدہ مخالفین کے لئے یہ ناقابلِ برداشت تھا اور تب اچانک جنوری ۱۹۷۳ء میں واٹر گیٹ سکینڈل پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آن گرا۔

معافی! چاہے وہ کتنا ہی بے دست و پا ہو جاتا' نکسن کبھی ہار نہ مانتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے چکر میں پھنس کر

حکومت پر ایسی گرفت نہ کر سکتا جو تاریخ میں بے مثال تھی۔"

(ٹ) ''واشنگٹن میں طاقت کے چار بڑے ستون ہیں۔ اہمیت کے لحاظ سے ان کی ترتیب یہ ہے۔

(1) پریس

(2) بیوروکریسی

(3) کانگریس

(4) خفیہ ایجنسیاں

جنوری ۱۹۷۳ء میں ان میں سے ہر ایک صدر کی زد میں تھا اور صدر بھی ایسا جو امریکی عوام میں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا۔ چنانچہ واٹر گیٹ کا سلسلہ شروع ہوتے ہی طاقت کے ان بلاکوں میں سے ہر ایک نے جوشِ انتقام سے بھرپور وار کیا کہ صدر رچرڈ نکسن تھا۔ ۷۳ء کی جنوری' فروری اور مارچ کے مہینوں میں یہ بلاک وائٹ ہاؤس پر حملہ آور ہو چکے تھے۔"

میں خود کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر سے نہیں ملا رہا' اور نہ ہی اپنے پسماندہ ملک کو ایک سُپر پاور سے۔ میری یہ مجال! تاہم اگر واشنگٹن میں طاقت کے چار ستون ہیں تو اسلام آباد کے بھی چار ستون ہیں۔

(1) فوج

(2) افسر شاہی

(3) سرمایہ دار

(4) سیاست دان

میں عوام میں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا' جب میرے خلاف سازش شروع کی گئی۔ ابتدا میں پی این اے کی تحریک عوام کے ابھارنے میں ناکام رہی تھی۔ میرا ارادہ تنظیم نو اور اصلاح کے ایک عظیم پروگرام پر عمل درآمد کا تھا' مارچ ۷۷ء کے انتخابات میں عوام کی طرف سے ملنے والی تازہ تائید کے بل پر۔ اور ہیلڈ مین کی ''خفیہ ایجنسیاں'' اس سے باخبر تھیں۔

وائٹ پیپر میں پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں ریاست کی خفیہ ایجنسیوں کو حکومت کے سیاسی بازو کے طور پر استعمال کرنے پر مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے ہیں اور اپنی پارسائی کا اظہار کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۹۵ پر اپنے اس غم و غصے کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''پی پی پی حکومت کے سیاسی بازو کے طور پر ریاست کی خفیہ ایجنسیوں کا استعمال، خصوصاً عام انتخابات کے زمانے میں، بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ جب انٹیلیجنس بیورو اور انٹر سروسز انٹیلیجنس جیسے حساس اداروں میں سیاست گھس آئے تو پھر یہ ریاست کی اندرونی اور بیرونی سیکورٹی کا بنیادی کام صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتے۔ حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتیں، جو ایک جمہوری معاشرے کا لازمی جزو ہوتی ہیں، سیاسی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں اور ریاستی سیکورٹی کا کام مسخ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔''

اس موقف کی حمایت میں صفحہ ۱۹۷ میں فوجی ٹولے کے موجودہ وزیر قانون اے کے بروہی کی ان معروضات سے اقتباس دیا گیا ہے، جو انھوں نے بیگم نصرت بھٹو کی درخواست کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ میں پیش کی تھیں۔

بروہی صاحب فرماتے ہیں:

''اس تمام عرصے میں انٹیلیجنس بیورو مسٹر بھٹو کی ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔''

اس کے علاوہ اسی درخواست سے ایک اقتباس اور بھی ہے یہ صفحہ نمبر ۱۸۱ پر ہے۔

''مسٹر بھٹو نے ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو کو بھی ایسی ہی ہدایت جاری کی۔ مسٹر اے۔ کے بروہی نے مسٹر زیڈ۔ اے۔ بھٹو کی نظر بندی کے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران فیڈریشن کی طرف سے دلائل دیتے ہوئے سپریم کورٹ میں کہا:

(الف) ''جب ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو نے یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو مسٹر بھٹو کو پیش کی جانے والی رپورٹ میں اپوزیشن پارٹیوں کے اشتراکِ عمل کے امکان کی نشاندہی کی تو مسٹر بھٹو نے درج ذیل حکم جاری کیا:

''برائے مہربانی اس پر کڑی نظر رکھیں۔ ان کو متحد ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ یہ ایک اصول کی بات ہے۔'ڈر یا خوف کی نہیں۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ انھیں الگ الگ رکھیں۔''

مجھے بتایا گیا تھا کہ جب غلام مصطفیٰ کھر نے مسٹر رؤف طاہر کو پنجاب گھی بورڈ کا انچارج بنایا تھا تو اس نے بہت مال کمایا تھا۔ کیا اس کی تحقیقات نہیں ہوسکتی۔''

(ب) ''جب وزیراعظم کے چیف سکیورٹی آفیسر نے ۵ مئی ۱۹۷۶ء کو اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد کے لئے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں رپورٹ پیش کی' تو مسٹر بھٹو نے حسب ذیل حکم جاری کیا:

''آپ انھیں متحد ہونے نہیں دے سکتے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔''

دوسری طرف' انٹرسروسز کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹننٹ جنرل جی۔ جیلانی جنھوں نے خود کو اور اپنی ملٹری انٹیلیجنس کو $5\frac{1}{2}$ سال تک میرے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے استعمال کی اجازت دی اور جنھوں نے' وائٹ پیپر ہی کے صفحہ نمبر ۶۶ کے مطابق' حکومت کو پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا تھا:

''سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں جو مرتبے اور مقام میں جناب بھٹو کے پاسنگ بھی ہو۔

جناب بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی مقام اور شہرت

رکھتے ہیں اور جنھیں بین الاقوامی سیاسیات کی پیچیدگیوں کا گہرا علم اور تجربہ ہے۔ انھوں نے پاکستان کے لئے عظیم الشان خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کا نشان ہیں۔"

لیفٹنٹ جنرل جیلانی ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو میرے صدر پاکستان بننے سے پہلے انٹر سروسز انٹیلیجنس کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ وہ اس حساس عہدے پر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک فائز رہے۔ فوجی انقلاب کے چند ماہ بعد انھیں سکریٹری دفاع کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اور آج بھی وہ اس انتہائی اہم عہدے پر متمکن ہیں۔ اگر وہ زیرِ عتاب ہوتے یا ان کے ساتھی جرنیل انھیں میرا پرلے درجے کا خوشامدی سمجھتے ہوتے تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے روز یا اس کے فوراً بعد اور بہت سوں کی طرح رخصت ہو چکے ہوتے۔ جنرل جیلانی کے سوا وفاقی سطح کے تمام انٹیلیجنس افسر فوجی انقلاب کی رات یا ایک ماہ کے اندر اندر گرفتار کر لئے گئے تھے۔

اور غالباً میرے خصوصی معاون راؤ عبدالرشید' فیڈرل سیکورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود' انٹیلیجنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر شیخ اکرام سب ۵ جولائی ہی کو حراست میں لے لئے گئے تھے۔

میرے خیال میں چیف سیکورٹی افسر سعید احمد خان وسط جولائی اور اوائل اگست ۱۹۷۷ء کے درمیان گرفتار ہوئے اور سابق سکریٹری داخلہ فضل حق فوری طور پر ملازمت سے برخاست کر دیئے گئے تھے۔ اس وقت کے سکریٹری داخلہ ایم اے کے چوہدری' جو پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس کے بھائی تھا' اس اعزاز سے محروم رہے۔ ان کو یہ اعزاز اپنے بھائی کے ساتھ ہی ملا۔ لیکن ملٹری انٹیلیجنس کے سربراہ یعنی لیفٹنٹ جنرل جیلانی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔ اس کے برعکس وہ جہاں تھے' مزے سے رہے اور بعد میں سکریٹری بنا کر وزارتِ دفاع میں پہنچا دیئے گئے۔ ۵ سال تک میرے انٹیلیجنس آفیسر ہونے کی حیثیت سے وہ میرے خیالات تک رسائی رکھتے تھے۔

وزیرِاعظم پاکستان کے طور پر دوبارہ منتخب ہونے کے بعد جن نازک موضوعات پر میں نے ان سے گفتگو کی' ان میں سے چند یہ تھے:

(1) وفاقی سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کی مکمل تنظیم نو۔

(2) سینٹرل انٹیلی جنس کا ایک مربوط انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ادغام جس کو دو درجوں میں تقسیم کیا جائے۔

داخلی

خارجی

(3) اصلاحات

لیفٹننٹ جنرل جیلانی سے میری مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں گرما گرم اور جاندار بحثیں ہوتی رہیں۔ اگر فوجی ٹولہ میرے خفیہ ایجنسیوں کے ناجائز استعمال سے اتنا ہی ناراض ہے تو انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹننٹ جنرل جیلانی کو اپنے ساتھی جرنیلوں کا نشانہ نمبر ایک ہونا چاہیے تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجھے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انھوں نے مجھے قاتل اور جدید میکاویلی قرار دیا ہے۔ معیشت کو تباہ کرنے کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ میری وجہ سے ملک خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ متعدد مسلم ممالک اور چین کا دورہ کرتے ہوئے وہ فائلیں اور دستاویزات ساتھ لے کر گئے تاکہ مجھے قاتل اور خطرناک انسان ثابت کرسکیں۔ اس کے برعکس انقلاب سے چند ماہ قبل لیفٹننٹ جنرل جیلانی نے تحریراً فرمایا تھا اور میں اقتباس کو پھر دہراتا ہوں:

> ''اس وقت سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں، جو مرتبے اور مقام کے لحاظ سے جناب بھٹو کے پاسنگ بھی ہو۔ جناب بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی مقام اور شہرت رکھتے ہیں اور جنھیں بین الاقوامی سیاسیات اور پیچیدگیوں کا گہرا علم اور تجربہ ہے۔ انھوں نے پاکستان کے لئے عظیم الشان خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کا نشان ہیں۔''

جب ملک کے بدقسمت شہریوں پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں۔ جئے بھٹو کہنے کی

پاداش میں قید اور کوڑوں کی سخت سزائیں دی جارہی ہوں' جب عورتوں پر لاٹھیاں برسائی جارہی ہوں' آنسوگیس پھینکی جارہی ہو' میرے لئے درگاہوں پر دعا مانگنے کے جرم پر انھیں جیلوں میں ٹھونسا جارہا ہو۔ یہ بات عقل وفہم سے بعید ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ' جو میری ناگزیر قیادت کے بارے میں ایسی خوشامدانہ رپورٹیں بھیجا کرتا تھا' فوجی ٹولے کے ڈھانچے میں اس قدر اہم عہدے پر کیسے فائز ہے۔ اس سوال کو لیفٹننٹ جنرل جیلانی کی مجھے (تب کے) میجر جنرل ضیاء الحق چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کے لئے چھ جرنیلوں کی حق تلفی کر کے تقرری کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیابی کے ساتھ ملا کر دیکھا جانا چاہیے۔ یہ کہانی کا صرف ایک حصہ ہے۔ مگر اس معمولی سی نقاب کشائی کے ساتھ بھی میں یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کس نے کس کا استحصال کیا۔ کیا ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ اور اس کے چیف آف اسٹاف نے میرا استحصال کیا یا میں نے ان کا؟

ایوب خان اور یحییٰ خان نے خفیہ ایجنسیوں کو کیسے استعمال کیا؟ یحییٰ خان نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات پر اثر انداز ہونے اور سیاست دانوں میں اختلافات کو ہوا دینے کے لئے خفیہ ایجنسیوں کو استعمال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مجھے اس کا اچھی طرح علم ہے کیونکہ میں بھی ان کا نشانہ تھا۔ میری پارٹی پر خفیہ ایجنسیوں کا شدید دباؤ تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد یحییٰ خان کے مارشل لاء کے زوال تک۔ سول اور ملٹری خفیہ ایجنسیاں منتخب نمائندوں پر قابو پانے کے لئے میری پارٹی میں گھسنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہیں۔

بنگلہ دیش کے مرحوم صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے جنوری ۱۹۷۲ء میں لندن کے لئے روانہ ہوتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی خواہش ہے کہ مغربی پاکستان سے وہ صرف پانچ افراد پر ہاتھ ڈالنے چاہتے ہیں تاکہ انھیں پلٹن میدان میں سرِ عام پھانسی پر لٹکا سکیں۔ ان پانچ میں سے دو کا تعلق سول اور فوجی خفیہ اداروں سے تھا۔

مجیب الرحمٰن نے سیاست کے میدان میں ان لوگوں کی ''کارگزاریوں'' کی کافی

تفصیلات بتائیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہمارا تجربہ بھی ان سے مختلف نہیں رہا۔

ایوب خان نے بھی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی۔ اس نے جمہوری مجلس عمل کو سول اور ملٹری خفیہ اداروں کی مدد سے توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے انہی اداروں کے ذریعے چاہا کہ میری پارٹی کی بنیاد ہی نہ رکھی جا سکے۔ اس نے ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۶۷ کو ہمارے تاسیسی اجلاس کو سبوتاژ کرنے اور انہی خفیہ اداروں کے ذریعے اپنے خلاف میری تحریک کو روکنے کی کوشش کی۔ ایوب خان کے خفیہ اداروں کے ''مثالی'' استعمال کے ثبوت میں صرف تین واقعات پیش کرتا ہوں۔

1- جب ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو ہماری ملٹری انٹیلی جنس کی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بھارتی بکتر بند ڈویژن کے محل وقوع کا پتہ چلانے میں ناکام رہے۔ ایوب خان غصے سے پاگل ہو گیا اس نے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر جنرل کو راولپنڈی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ بریگیڈیر ریاض حسین، جو بعد میں جنرل ریاض حسین بنے (اور یحییٰ خان کی حکومت کے بلوچستان کے گورنر رہے) ان دنوں ڈائرکٹر جنرل تھے۔ میں وزیر خارجہ کی حیثیت میں موجود تھا۔ ایوب خان نے ریاض حسین کے ساتھ بُری کی۔ اس نے کہا کہ ملٹری انٹیلی جنس ملک کے لئے شرمندگی کا باعث بنی ہے۔ میں نے بریگیڈئیر ریاض حسین سے کہا کہ بھارتی بکتر بند ڈویژن بھوسے کے ڈھیر میں گم کوئی سوئی تو نہیں، جو مل نہ سکے۔ صدر ایوب خان نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ ''وہ ایک دیو ہے، سوئی نہیں'' وہ بار بار بریگیڈیئر ریاض حسین سے وضاحت طلب کرتے رہے کہ خفیہ ایجنسیوں کو آخر کیا ہو گیا

ہے۔ اور بریگیڈیئر ریاض کا نپتی آواز سے صرف یہ کہتے رہے۔ ''سر' جون ۱۹۶۴ء سے فوجی ایجنسیاں انتخابات اور انتخابات کے بعد کے حالات کے بارے میں سیاسی کام کرتی رہی ہیں' چند روز بعد ہم نے بھارتی بکتر بند ڈویژن کو خفیہ اداروں کی مدد سے نہیں' بلکہ اتفاق سے دریافت کرلیا۔ ایک بھارتی قاصد جموں میں ایک مجاہد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس سے برآمد ہونے والے کاغذات سے ہمیں مطلوبہ معلومات مل گئیں اور جان میں جان آئی۔

-2 ایوب خان کی خصوصی ہدایات کے تحت خفیہ ایجنسیوں نے ۱۹۵۶ء میں صدارتی امیداوار کے طور پر جنرل اعظم خان کا راستہ روکا تھا۔

-3 نومبر ۱۹۶۴ء کے آغاز میں میرے ایک بہت قریبی دوست اور مشرقی پاکستان کے ممتاز سیاستدان مجھ سے ملنے ۷۰ کلفٹن کراچی میری رہائش گاہ آئے۔ وہ متحدہ اپوزیشن کی اہم شخصیت تھے۔ کھانے کے بعد اور رخصت ہونے سے پیشتر انھوں نے اپنی آنکھیں سیکڑیں اور یہ انکشاف کیا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ایک سابق وزیر اعظم ایک ایسا دھماکہ کرنے والے ہیں کہ ایوب خان اور ہم سب کا دور دور تک پتہ نہ چلے گا۔ میں نے اس کے دعوے کو ایک بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر اس نے مزید کہا۔

''دیکھو دوست! میں زیادہ تفصیلات تو نہیں جانتا مگر اس کا تعلق کسی ٹیلیگرام سے ہے جو ایوب خان

نے واشنگٹن سے اس وقت کے وزیراعظم پاکستان کو
صدر ناصر کے بارے میں بھیجا تھا۔''
(اس وقت ایوب خان فوج کے کمانڈر انچیف تھے)
راولپنڈی واپسی پر میں نے صدر ایوب خان سے
اس گفتگو کا تذکرہ کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ
دیر کے لئے وہ چھت کو گھورتے رہے' میز سے
قینچی اٹھا کر اس سے کھیلتے رہے' پھر کہنے لگے
''مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے اور مجھے اچھی طرح
یاد نہیں کہ میں نے کیا لکھا تھا اور وہ تقسیم کے لئے
تھا بھی نہیں۔''

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے واشنگٹن میں ہماری چانسری میں سفارت خانے کی نقل تو جلا دی تھی اور پاکستان واپسی پر دفتر خارجہ کی اور دوسری محفوظ کاپی کو بھی ضائع کروا دیا تھا۔

میں نے کہا ممکن ہے بڑے میاں وزارتِ عظمےٰ سے فراغت کے بعد اپنی کاپی ساتھ ہی لے گئے ہوں۔ میں نے ایوب خان سے یہ بھی کہا کہ اگر انھیں یہ یاد ہے کہ انھوں نے خفیہ تار کی نقول کا کیا کیا تھا تو یہ بھی یاد کریں کہ اس میں لکھا کیا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تار کو حاصل کرنا زیادہ اہم ہے انھوں نے انٹرکنیکٹر دبا کر ملٹری سکریٹری سے کہا۔

''نوازش' ڈی آئی بی' اور ڈی جی آئی ایس آئی سے کہو کہ فوراً آ ئیں'' نصف گھنٹے کے اندر دونوں صدر کے دفتر میں موجود تھے۔ ایوب خان نے انھیں وہ سب کچھ بتایا جو مجھے بتا چکے تھے۔ اس کے بعد وہ ان کی طرف جھکے اور کہنے لگے۔ ''حضرات' مجھے وہ بلڈی ٹیلی گرام ہر قیمت پر

چاہیے۔ چاہے وہ قیمت فورٹ ناکس کا سارا سونا ہی کیوں نہ ہو۔''

۲۰ روز کے بعد مجھے صدر کے اے ڈی سی نے بتایا کہ صدر مجھے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے دفتر میں گیا تو ایوب خان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا اور تار ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے تار پڑھنے کے بعد کہا۔

''جناب صدر، میری انگلیاں جل رہی ہیں۔ برائے مہربانی اس دستاویز کو جلا ڈالیں۔''

ایوب خان نے سگریٹ نوشی ترک کر رکھی تھی۔ میں سگار پیتا تھا مگر ماچس یا لائٹر ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ڈیسک پر پڑا چاندی کا سگریٹ لائٹر اٹھایا اور شائستگی سے ایوب خان کو تھما دیا تا کہ وہ رسم ادا کر سکیں۔

یہ ایک خفیہ ایجنسی کا شاندار سیاسی کارنامہ تھا مگر یہ صدر کی ذات کے لئے اور اس کے انتخابی مفادات کے لئے تھا۔

میں بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں مگر میرا موقف واضح ہو چکا ہے۔ میرے زمانے کے خفیہ ادارے وہ کرتب نہیں دکھاتے تھے جو مارشل لاء کے آمروں کے دور میں دکھاتے رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ اب یہ ادارے کیا کر رہے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ منظرِ عام پر آ جائے۔

۶......

خفیہ ہاتھ

وائٹ پیپر کے مطابق میں نے انتخابات کی تیاریاں کم از کم ۱۹۷۴ء ہی سے شروع کر دی تھیں۔ میں نے ماڈل پلان بنائے "ایک زبردست مشینری تشکیل دی۔" اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔ آخر میں نے اس قدر تفصیلی احتیاطی تدابیر کیوں اختیار کیں؟ اگر مقصود میرے مزاج اور طریقہ کار کو بے نقاب کرنا ہے تو اور بات ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں ہر کام میں کامیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر یہی عادت دھاندلی کے الزام کی نفی کے لئے کافی ہے۔ دھاندلی منصوبہ بندی اور تیاریوں کا متضاد ہے۔ اگرچہ دھاندلی کے ممکنہ خطرات سے میں اپنے تحریری احکامات اور کانفرنسوں میں ہدایات کے ذریعے خبردار کرتا رہا تھا مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ اپوزیشن ایک چوں چوں کا مربہ تھی۔ عجیب و غریب جانوروں کا ایک باڑہ - یہ صفر+صفر=صفر کی حقیقی مثال تھی۔ اس کی اصل طاقت غیر ملکی کرنسی کے لاکھوں صفروں سے تھی۔ جہاں تک سیاسی خانہ بدوشوں کے اس ملے جلے ٹولے کے سطحی اتحاد کا تعلق ہے، وائٹ پیپر کو بھی تسلیم ہے کہ مجھے انتخابات سے بہت پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔ یہ ہماری سیاست کے رواج کے عین مطابق تھا۔ اس سے قبل جگتو فرنٹ سی او پی اور ڈیک کی مثالیں موجود تھیں۔ اس لئے میں اس سلسلے میں کسی غیر معمولی بصیرت کا دعویدار

نہیں۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء کو راؤ رشید کو ایک نوٹ میں میں نے کہا تھا:

''یو ڈی ایف کے اندر اور اس سے باہر اپوزیشن قریب تر ہو رہی ہے۔ یہ اپنے تضادات کو کم کرنے اور مصالحت کی کوششوں میں مصروف ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوششیں تیز تر ہوتی جائیں گی اور جوں جوں انتخابات قریب آئیں گے' متضاد سیاسی عناصر کے اتحاد کی خاطر سمجھوتے کرنے کی ضرورت بڑھتی جائے گی۔

ہم اس ممکنہ اتحاد کو روکنے اور ان کے تضادات کو ہوا دے کر صلح صفائی کے امکانات کو گھٹانے کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ ہمیں متحرک رہنا چاہیے۔ اپنے منصوبے تیار رکھنے چاہئیں اور ان کے ہر قدم پر گہری نظر رکھنا چاہیے۔ ان کے ہر اقدام کے ساتھ ساتھ ہمارے جوابی اقدامات تیار ہونے چاہئیں۔ ہمیں چاہیے کہ اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح سے ان میں انتشار پیدا کریں۔ ہمیں ان کی صفوں میں افراتفری پیدا کرنے کے لئے' ان میں ایک دوسرے کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کے لئے' ایک دوسرے سے متنفر کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ استعمال کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس اس کے لئے کوئی مشینری نہیں ہے۔ ہم صرف اپوزیشن کی درجہ بدرجہ اتحاد کی طرف پیش قدمی کو گھٹا کر تسلی بخش رپورٹیں مجھ تک بھیجنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

اپوزیشن اس ماہ کے آخر میں لاہور میں پھر جمع ہو رہی ہے' یعنی اس ماہ میں دوسری مرتبہ۔ کیا اس اجلاس کے لئے ہمارے منصوبے تیار ہیں؟ کیا انھیں گمراہ کرنے یا ان کی توجہ ہٹانے کے لئے' ان میں سے کسی سے ہمارا رابطہ ہے؟ میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے؟

میں نے یہ اقتباس پورے کا پورا نقل کیا ہے۔ میں نے مستقبل کے واقعات کو بھانپ لیا

تھا اور اس کے لئے تیار تھا۔ اس نوٹ میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ متضاد کو متضاد ہی رہنا چاہیے اور خلائی جادوگروں کو پاکستان میں نازل ہو کر نو جنگلی بلیوں کی دُمیں آپس میں باندھنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔ میں نے کھیل کے قواعد کی پابندی کا مشورہ دیا تھا۔ کھیل نیا نہیں۔ یہ کھیل سیاست میں یونانی شہری ریاستوں کے زمانے سے کھیلا جاتا رہا ہے۔ اور آج بھی کھیلا جاتا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے اتحاد کی صورت میں میری حکومت کے پاس دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس کے برعکس میں نے مناسب تیاریوں کے بروقت وارننگ دی تھی، دھاندلی کے لئے نہیں۔ یہ دھاندلی کے خلاف ایک وارننگ تھی۔ یہ ایک متحدہ اپوزیشن سے انتخابی لڑائی لڑنے کے لئے تیار رہنے کی ہدایت تھی۔ جس چیز نے مجھے حیران کیا اور جس کی مجھے توقع نہ تھی، وہ طاقتیں تھیں جو اپوزیشن کی پشت پر جمع ہو گئی تھیں ان طاقتوں نے دسمبر ۱۹۷۶ء کے وسط سے جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ مجھے خفیہ ہاتھوں کے بارے میں اطلاعات جنوری ۱۹۷۷ء کے آغاز سے ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ رفیع رضا نے مجھ سے ساڑھے چار گھنٹے کی ملاقات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) تشکیل پا رہا ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کا صدر کون ہوگا اور دوسرے عہدے دار کون کون سے ہوں گے۔ اس نے مجھے اس منصوبے کے اسباب، اس کی حکمت عملی اور مقاصد کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اپنے تجزیے کے آخر میں اس نے مجھے تین متبادل تجویز کئے۔

(الف) ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جاؤں اور اپوزیشن کا اتحاد نہیں ہوگا۔

(ب) انتخابات کو ملتوی کر دوں۔ یا

(ج) خطرناک نتائج کے لئے تیار ہو جاؤں۔

اس کا اصرار تھا کہ میں ان معلومات کے ذریعے کو جاننے پر زور نہ دوں مگر یہ کہ ان تمام منصوبوں کے بارے میں وہ مصدقہ اطلاعات کی بنیاد پر بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے رائے مانگی۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جاؤں۔ اور یہ یقینی ہے کہ اپوزیشن اس کو انتخابی مسئلہ نہیں بنائے گی۔ صرف عوام کو بدھو بنانے کے لئے کبھی کبھار سرسری ساذکر کیا جائے گا، اس امید پر کہ عوام ری پراسیسنگ پلانٹ اور ایٹمی پاور پلانٹ میں فرق نہیں جان سکیں گے۔ رفیع رضا نے

مجھے خبردار کیا کہ میرے اردگرد جو لوگ جمع ہیں اور جو اس وقت مجھے اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے کے مشورے دے رہے ہیں اور بڑی جذباتی تقریریں کرتے ہیں' وقت پڑنے پر جب پردہ گرے گا' تو کہیں نظر نہ آئیں گے۔ ہم نے یہ گفتگو کھانے کی میز پر بھی جاری رکھی۔ اس کے بعد میں نے اس قدر اہم معلومات اور مشورے دینے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ تاہم میں نے اسے بتا دیا کہ اب انتخابات ملتوی کرنے کا وقت نہیں رہا اور نہ ہی ری پراسیسنگ پلانٹ کا مسئلہ بھلایا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہم انتخابات منصفانہ طریقے سے جیتیں گے اور اگر نہ جیت سکے تو اپوزیشن کو آزادی ہوگی کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کے معاہدے کو منسوخ کردے۔ اس میں ترامیم کرے یا اسے کنوئیں میں ڈال دے۔ رفیع رضا نے کہا کہ اسے ہماری منصفانہ انتخابات میں کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مگر شاید ہم اس کامیابی کا مزا نہ چکھ سکیں۔ چونکہ وہ مزید وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے جواب دیا:

''تو کیا ہوا۔ یا ہم الیکشن ہار جائیں گے یا کامیابی کا مزا نہیں چکھ سکیں گے۔''

اپنی موٹے شیشوں کی مڑے ہوئے فریم والی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی مانگ اور بالوں کی پشت پر ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے کہا:

''مگر سر! میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ صرف انتخابات یا عہدے کا مسئلہ نہیں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا:

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور تم میرا جواب۔''

رخصت ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہی۔ میں نے کہا ''ضرور''

اس پر اس نے پوچھا۔ ''آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ آخر آپ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس قدر مہیب خطرات کیوں مول لے رہے ہیں؟'' میں نے اسے بتایا کہ میں یہ سب اس لئے کر رہا ہوں تا کہ ایک منصفانہ معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکے' میرا ملک مضبوط اور اور جدید بنے' میرے عوام جن کو مسرت کے لفظ کے معنی تک معلوم نہیں' ان کی زندگیوں میں خوشیاں بھری جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ شاید آنسو تو ہمیشہ بہائے جاتے رہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ کم سے کم' اور کم شدت سے بہیں۔

میرے ڈاکٹر' نصیر شیخ' وزیر پیداوار کے رخصت ہونے کے بعد ملاقات کے لئے آئے۔ڈاکٹر ایک باریک بین آدمی ہیں۔انھوں نے کہا کہ وہ نروس اور پریشان نظر آتا تھا۔

''سر!وہ کسی بھوت کی طرح سفید نظر آتا تھا۔''

نصیر شیخ نے مجھ سے پوچھا آیا میں نے اس سے کوئی سخت بات کر دی تھی۔ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''نہیں''...... میں نے کہا...... ''میں نے اس سے کوئی تلخ بات نہیں کہی۔مگر جو موضوع زیر بحث تھا' وہ بہت تلخ تھا۔''

پی این اے کا قیام میرے لئے غیر متوقع نہ تھا۔ میں ماضی کی روایات کے پیش نظر اس کا منتظر تھا۔رفیع رضا نے مجھے منصوبے کے بلیو پرنٹ سے اور اس کو اڑانے کے بارود دونوں سے آگاہ کر دیا تھا۔فرق صرف یہ تھا کہ ''جگتو فرنٹ'' سی' او' پی اور ڈیک دیسی کارروائیاں تھیں۔ پی این اے کا اتحاد کوئی دیسی سازش نہ تھا۔رفیع رضا پہلا شخص تھا جس نے اس کے غیر ملکی رنگوں کی نشاندہی کی۔ وائٹ پیپر میں صفحہ ۳۸۴ میں کہا گیا ہے کہ میں نے ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو سینیٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ کوئی دیسی سازش نہیں ہے۔یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے خلاف ایک خوفناک اور زبردست سازش۔''

اور میں حرف بہ حرف سچا تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔کیل سر میں ٹھونک دی گئی ہے۔

اگر پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام کو متاثر یا تباہ کرنے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو اس کی اگر تمام تر نہیں تو بنیادی ذمہ داری پی این اے اور فوجی ٹولے پر عائد ہوگی۔اسی لئے دونوں اداکار ملی بھگت سے کھیل کھیل رہے ہیں۔غیر ملکی حکومتوں کی اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں۔صرف ہم' پاکستان میں' غیر ملکی حکومتوں کی پالیسیوں پر چلتے ہیں۔ جتنا وہ خود انحصاری کی بات کرتے ہیں' اتنے ہی محتاج ہوتے جاتے ہیں' جس قدر وہ عدم مداخلت پر زور دیتے ہیں' اتنی ہی زیادہ مداخلت کی اجازت دیتے ہیں' جس قدر وہ آزادی کی بات کرتے ہیں' اتنے ہی غلام ہوتے جاتے ہیں۔

......7

لڈو، حلوہ اور سزائے موت

ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ

تین سال کے مسلسل مذاکرات کے بعد مارچ ۱۹۷۶ء میں فرانس اور پاکستان کے درمیان ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ طے پایا۔ فرانس تحفظات کے مسئلے پر بالکل مطمئن تھا۔ معاہدہ پاکستان کی طرف سے میری حکومت اور فرانس کی طرف سے صدر جسکارد کے مابین طے ہوا اور وی آنا کمیشن نے اس کی توثیق کی۔ کمیشن میں شامل امریکی نمائندے نے توثیق کے حق میں رائے دی۔ اگر بین الاقوامی ایٹمی کمیشن تحفظات کے بارے میں مکمل طور پر مطمئن نہ ہوتا تو اس سلسلے میں مطلوبہ توثیق اور رضا مندی کبھی نہ دیتا۔ اگست ۱۹۷۶ء میں میں نے امریکہ کی متبادل تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اس وقت فرانسیسی حکومت نے بھی امریکی مداخلت پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک فرانس نے بنیادی معاہدے کے بارے میں مضبوط مؤقف اپنائے رکھا۔

چودہ ماہ تک پاکستان کے عوام کو ترسائے اور مسلح افواج کو لٹکائے رکھنے کے بعد بالآخر

جنرل ضیاء کو ۲۳ اگست ۱۹۷۸ کو راولپنڈی کی پریس کانفرنس میں تسلیم کرنا پڑا کہ انھیں فرانس کے صدر کا ایک پیار سے بھرا شائستہ خط ملا ہے۔ مگر اس سے بات نہیں بنتی۔ انھوں نے یہ منحوس خبر سنائی کہ فرانس مذاکرات کے ذریعے معاہدے میں تبدیلیاں چاہتا ہے۔ سو یہ ہے اصل معاملہ!

دراصل صدر فرانس نے انھیں منہ چھپانے کا موقع دیا ہے مگر پلانٹ کی پلوٹونیم جدا کرنے کی استعداد کا موقع نہیں دیا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ کہانی ختم۔ فرانسیسی حکومت نے معاہدہ ایک سول اور آئینی حکومت سے کیا تھا' کسی فوجی آمریت سے نہیں۔ معاہدہ عالمی حیثیت کے مالک ایک منتخب وزیراعظم سے طے پایا تھا۔ جسے تینوں فرانسیسی صدر ڈی گال' پومپیدو اور جسکارد دیستا نگ کی نظروں میں وقعت حاصل تھی۔ یہ کسی ایسے بے اعتبارے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے نہیں ہوا تھا جو اپنے ہی عوام سے کئے ہوئے وعدے ڈھٹائی سے توڑ دیتا ہے۔

میری حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی جلدی میں تب ان تبدیلیوں کے خطرناک اثرات کا خیال نہیں کیا گیا۔ اس وقت تو ''بعد میں دیکھا جائے گا'' کا رویہ اپنایا گیا۔ مگر قوم کی زندگی اور موت کا یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا جس پہ ایسا غیر ذمہ دارانہ اور سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سیاست کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ اب جب کہ سفاری کے مشقتیوں کا سپر پاور شکاریوں سے سامنا ہوا ہے تو چاہ کن را چاہ درپیش والا معاملہ ہو گیا ہے۔

حکومت اس بنیادی تبدیلی کے خطرے سے نمٹنے کیا ارادے رکھتی ہے؟ مزید غیر ملکی امداد؟ اب جبکہ سرکاری طور پہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ چھن چکا ہے' مزید امداد ملے یہ نہ ملے' اب پاکستان کو یقیناً پہلے سے بھی زیادہ محتاج اور دست نگر بننا پڑے گا۔ اب یہ ایٹمی بلیک میل کے فن کے ماہر پیشہ وروں کے رحم و کرم پر ہو گا۔

بھارتی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی سے نئی دہلی میں ملاقات کے بعد بھیجے جانے والے صدر کارٹر کے سخت خط کے باوجود بھارت امریکہ ہی سے یورینیم حاصل کر رہا ہے۔ سخت خط کا مرار جی ڈیسائی کو کیا فرق پڑتا ہے جب تک اسے مزید دھماکے کرنے کے لئے یورینیم ملتا رہے۔ اس کے برعکس جنرل ضیاء صدر جسکارد کے ''شائستہ خط'' ہی پر پھولے نہیں سماتے چاہے اس میں

یہی کہا گیا ہو کہ پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم رکھنے کے لئے معاہدے پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔فرانسیسی بڑی شائستہ قوم ہیں۔انھوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کو پھانسی چڑھانا دو سو سال پہلے ترک کر دیا تھا۔یہ فطری امر تھا کہ جنرل ضیاء کو خوبصورت پلانٹ کی موت کی اطلاع دینے کے لئے فرانسیسی صدر نے فصیح فرانسیسی زبان سے نرم ترین الفاظ کا انتخاب کیا۔مگر نرم ترین خط بھی اس درد اور اذیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا' جو اس اقدام سے پیدا ہوئی ہے۔مگر کمپلیکسوں کے مارے جنرل ضیاء نے خط کی شائستگی کا ذکر کر کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہی تھا۔کیسی ذلت ہے' ہم وطنو۔زندگی بھر کے خواب کی کیسی اذیت ناک شکست!

میں اکتوبر ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک کے انیس سالوں سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے سرگرمی کے ساتھ وابستہ رہا ہوں۔وزیرِ خارجہ' وزیرِ ایندھن' بجلی و قومی وسائل اور وزیرِ انچارج برائے ایٹمی توانائی کی حیثیتوں میں براہِ راست اسی پروگرام سے متعلق رہا ہوں۔جب میں نے پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کا کنٹرول سنبھالا تھا تو یہ محض برائے نام عہدہ شمار ہوتا تھا۔میں نے پختہ عزم اور تن دہی کے ساتھ اپنے ملک کے لئے ایٹمی استعداد حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیں۔میں نے سینکڑوں نوجوانوں کو ایٹمی سائنس کی تربیت کے لئے یورپ اور شمالی امریکہ بھیجا۔میں نے ایڈرورڈ سٹون کو ایٹمی توانائی کمیشن کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے کہا اور اسلام آباد کے ویرانے میں اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔میں نے ایٹمی توانائی کمیشن کے لئے ۵ میگاواٹ کے تحقیقاتی ری ایکٹر کا معاہدہ کیا۔وزیرِ خزانہ شعیب اور ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن سعید حسن کی شدید مخالفت کے باوجود میں نے کینیڈا سے ۱۳۷ میگاواٹ کا کراچی ایٹمی بجلی کا پلانٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اس کی افتتاحی رسم انجام دی۔۱۹۷۰ء کے وسط میں میں نے چشمہ ایٹمی بجلی گھر کی منظوری دی اور یقیناً فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے لئے مذاکرات کئے اور ۱۹۷۶ء میں معاہدہ کیا۔

میری تن تنہا کوششوں سے پاکستان نے ایٹمی استعداد کے لئے درکار بنیادی ڈھانچہ اور صلاحیت کر لی۔

ہمارے جیسے پسماندہ اور غریب ملک میں کھوئے ہوئے وقت کی تلافی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جب میں نے ایٹمی توانائی کی ذمہ داری سنبھالی تو پاکستان بھارت سے اس میدان میں سالہا سال پیچھے تھا مگر جب میں وزیراعظم تھا تو یہ فرق صرف ۵ یا ٦ سال کا رہ چکا تھا۔ اگر شروع سے ایٹمی پروگرام کی مخالفت کرنے والے طاقتور وزیر اور افسر نہ ہوتے تو میں اس فرق کو بالکل ہی کم کر سکتا تھا۔ ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے صرف امیر ملک ہونا ہی ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اوپیک کے ہر ملک کے پاس ایٹمی صلاحیت ہوتی۔ لازمی ضرورت بنیادی ڈھانچہ ہے۔ اسی لئے میں نے بیرونی ممالک میں ہزاروں ایٹمی سائنسدانوں کی تربیت کو اوّلین اہمیت دی۔ اب ہمارے پاس دماغ ہیں اور کراچی کا ایٹمی بجلی گھر بھی ہے۔ جس چیز کی اب ضرورت تھی وہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ تھا۔ بھاری پانی' یورینیم اور ایندھن تیار کرنے والے پلانٹ کے حصول کے لئے انتظامات ہو چکے تھے۔ جب میں حکومت چھوڑ کر اس پھانسی کوٹھری میں پہنچا تو ہم مکمل ایٹمی صلاحیت کی دہلیز پر تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے پاس مکمل ایٹمی صلاحیت ہے۔ یہودی' عیسائی اور ہندو تہذیبیں یہ صلاحیت حاصل کر چکی ہیں۔ کمیونسٹ طاقتوں کے پاس یہ صلاحیت موجود ہے۔ صرف اسلامی تہذیب اس سے محروم تھی۔ مگر یہ صورتحال بھی اب بدلنے والی ہے۔

امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنجر ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہ کہہ کر کہ پاکستان کو ری پراسیسنگ پلانٹ کی ضرورت محض اپنی انرجی کی ضرورت کے لئے ہے' امریکہ کی ذہانت کی توہین نہ کروں۔ میں نے جواب دیا کہ میں پاکستان کی انرجی ضروریات پر گفتگو کر کے امریکہ کی ذہانت کی توہین نہیں کروں گا اور وہ بھی جواباً پلانٹ کو زیر بحث لا کر پاکستان کی آزادی اور وقار کی توہین نہ کریں۔ جنرل کو صدر فرانس سے لیموں ملا' پاکستان کو لڈو ملا اور پی این اے کو حلوہ اور مجھے سزائے موت۔ جب میرے کروڑوں ہم وطن ایک بے رحم آسمان کے تلے ایٹمی بادلوں کے نیچے غیر محفوظ کھڑے ہیں' تو لب میری ایک جان سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وقت کی پکار تو یہ ہے کہ حکومت (ادھر ادھر کے وائٹ پیپروں کی بجائے) قوم کی زندگی اور موت کے اس

مسئلے پر تین جلدوں کا وائٹ پیپر شائع کرے۔ کوئی اور سوال عوام کے ذہنوں پر اتنا سوار نہیں، جتنا یہ آسیب۔ یہ وقت ہے کہ حکومت اپنی ترجیحات درست کرے۔ گو میں نے انتخابات میں دھاندلی نہیں کی تھی مگر پھر بھی کیا انتخابی دھاندلی ایٹمی استعداد کھونے سے بڑا جرم ہے؟ وطن کی سلامتی اور آزادی کو دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ سولیاں، جن کو محض ذاتی انتقام کی تسکین کے لئے نصب کیا جا رہا ہے، قوم کی گردن توڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سوال پر وائٹ پیپر کی جلدوں کی تقسیم تین حصوں میں ہونا چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ ضمیمے منسلک ہوں۔

جلد اوّل: ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے پاکستان کی مساعی۔

جلد دوم: ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی پاکستانی مساعی کے خلاف سازش۔

جلد سوم: سازش کی کامیابی اور اس کے نتائج۔

تمام جلدوں میں سرکاری کاغذات، میمورنڈم اور نوٹس سمیت مکمل دستاویزات بطور ضمیموں کے منسلک ہونی چاہئیں۔ جیسے ۲۶-۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو جاری کی جانے والی وائٹ پیپر کی دو جلدوں میں ہیں۔ حکومت نے ذاتی نفرتوں اور حسد کے اظہار کے لئے کیا شاندار راستہ نکالا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ نفرت اور حسد اتنا نہیں بڑھے گا کہ محض مجھ سے ریاست کا وفادار اور مستعد خادم ہونے کا اعزاز چھیننے کے لئے قومی مفادات کو بنیادی اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا جائے۔

۸......

دھاندلی کیا ہے؟

سرفرانسس بیکن اپنے ایک مشہور مضمون میں پوچھتے ہیں: ''سچ کیا ہے؟'' میں یہ پوچھنا چاہوں گا۔ ''دھاندلی کیا ہے؟

(الف) لغوی معنی بالکل واضح ہیں۔ دھاندلی کا مطلب ہے۔ 'فریب کاری کا منصوبہ بنانا یا اس کا مرتکب ہونا'۔ ان معانی کی روشنی میں یہ سوال کروں گا کہ کیا فوجی بغاوت برپا کر کے ۹۰ دن میں الیکشن کرانے کے لئے عملی طور پر قرآن پر وعدہ کرنے اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس سلسلے میں اعلان کے چند روز بعد انھیں منسوخ کرنے والے سنگین ترین دھاندلی کے مرتکب نہیں ہوئے؟ کیا عوام کو آئین سے محروم کر دینا فریب کاری نہیں؟ کیا ۲۵ جون ۱۹۷۸ء کی تقریر میں سی ایم ایل اے کا یہ کہنا فریب نہیں کہ انتخابات تبھی ہو سکتے ہیں جب مثبت نتائج حاصل ہونے کی یقین دہانی ہو جائے؟ اس فریبی منصوبہ بندی کا شاہکار الیکشن سیل کی تشکیل ہے جو دراصل

چیف الیکشن کمشنر کے ماتحت اقتدار کی عمر بڑھانے والا سیل ہے۔ چیف الیکشن کمشنر کی اپنی تقرری فریب کارانہ ہے کیونکہ چیف جسٹس اور چیف الیکشن کمشنر کی دوہری حیثیت میں اوہ اپنے خلاف شکایات کا فیصلہ بھی خود ہی کرنے کا مجاز ہے۔ فوجی حکومت اپنی منافقت اور تعصب کی وجہ سے خود سب سے بڑی دھاندلی باز ہے۔

(ب) اس نکتے کی وضاحت کے لئے ایک دلچسپ مکالمہ برموقع ہو گا۔ دو فوجی آمر گفتگو میں مصروف ہیں۔ ایک ایشیا سے' فیلڈ مارشل عزیز لودوہ' اور دوسرا افریقہ سے' جنرل ساکسواہ ۔۔ مارشل جنرل سے پوچھتا ہے:

''بڑے بھائی' یہ بتاؤ کیا تم لوگ انتخابات میں دھاندلی کیا کرتے ہو؟''

جنرل نے جواب دیا: ''یقیناً......'' اس کے بغیر ہم عوام کی حفاظت کیسے کر سکتے ہیں؟

فیلڈ مارشل لودوہ: ''خیر۔ ہم تو ان احمقوں سے انتخابات کا وعدہ ہی کرتے ہیں...... اور خدا کی قسم' کسی کو انتخابات اور ان کے وعدے کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہ دھاندلی کی محفوظ ترین اور صاف ترین شکل ہے۔''

جنرل ساکسواہ: ''آپ کی بات درست ہے مگر ذاتی طور پر میں ان بے وقوفوں پر اس شدت سے سواری کرتا ہوں کہ ان کی آواز ہی نہیں نکل سکتی۔ اسی طرح مجھے ان کی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

دراصل انتخابات حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہیں
جبکہ دھاندلی محض ذریعے کے حصول کا ذریعہ۔
(انھیں قابو میں رکھو کانفرنس میں ریکارڈ شدہ)

(ج) میں جنرل ضیاء کے پکے وعدوں اور ان بیانات کا حوالہ دے چکا ہوں جن میں انھوں نے تسلیم کیا تھا کہ بے قاعدگیاں انفرادی بنیادوں پر ہوئی تھیں اور یہ میری پالیسی نہ تھی۔ وائٹ پیپر میں مجھ پر دھاندلی کے الزامات کے سلسلے میں ایک بھی ثبوت نہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو جاری کردہ دستاویز کو ''مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بارے میں قرطاس ابیض۔'' کا نام دیا گیا ہے۔ پی پی پی اور پی این اے نے ان انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ دونوں اطراف سے تشدد اور بدعنوانیوں کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ دونوں فریقوں نے ایک شدید انتخابی جنگ لڑی تھی۔ وائٹ پیپر میں پی این اے پر تنقید کا کوئی لفظ تک نہیں۔ اس کی بجائے یہ پی این اے کی طرف سے وضاحتیں پیش کرتا ہے۔ یہ اپوزیشن کے اتحاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے چیلنج کرتا ہے کہ پی این اے کو باہر سے مالی امداد ملی تھی۔ یہ مجھ پر پی این اے سے تعصب برتنے کا الزام لگاتا ہے۔ پی این اے کے کرتوتوں کا وائٹ پیپر سے غائب ہونا قابلِ غور ہے۔ خصوصاً ۱۲ اگست ۱۹۷۸ء کے پاکستان ٹائمز میں پیش کی گئی لنگڑی توجیہات کے پیش نظر۔ یقیناً اس انتہائی یک طرفہ ضخیم کاٹھ کباڑ کو شائع کرنے پر ضمیر کی خلش محسوس ہوئی تھی۔ تبھی کسی گماشتہ صحافی کو بیہودہ قسم کی پردہ پوشی کے لئے مقرر کیا گیا۔ مضمون میں کہا گیا ہے۔

''وائٹ پیپر صرف انتخابات کے طرزِ عمل کی تحقیقات پر مبنی ہے اور کسی فاترالعقل کو بھی یہ معلوم ہوگا کہ انتخابات کا انعقاد پی این اے نے نہیں کروایا تھا۔''

مضمون میں کہا گیا ہے کہ اسی وجہ سے پی این اے کا وائٹ پیپر میں ذکر نہیں۔ تعصب اور جانبداری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی۔ پی این اے نے انتخابات نہیں کروائے تھے تو پیپلز پارٹی نے بھی نہیں کروائے تھے۔ انتخابات الیکشن کمیشن کی نگرانی میں ہوئے تھے، جس سے ہر قسم کی شکایات کی جاسکتی تھیں اور کی گئیں۔ وائٹ پیپر پیپلز پارٹی پر دھاندلی کے الزامات پر پھولا نہیں سماتا مگر پی این اے کی سرگرمیوں پر ایک سرپرستانہ خاموشی اختیار کرتا ہے۔ جیسے پیپلز پارٹی نے انتخابی مہم چلائی، ویسے ہی پی این اے نے بھی چلائی اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اس کا وائٹ پیپر میں ذکر لازمی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفائی کسی فاتر العقل کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی۔ یہ خلاء بعد میں سوچی گئی پُرفریب تاویلات سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے عیبوں پر اس قدر کھوکھلے طریقے سے پردہ ڈالنے سے وہ انھیں مزید نمایاں کر رہے ہیں۔ وائٹ پیپر کا فراڈ بالکل ہی بے نقاب ہو گیا ہے۔ ایک معمولی سا تذکرہ بھی شاید صفائی کے لئے کوئی بنیاد بن سکتا اور فریب کاری کے بڑے سوراخوں اور شگافوں کو پُر کرنے میں مدد دیتا۔ میں اس احمقانہ بہانے بازی کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتا اگر حکومت ڈھٹائی کے ساتھ اس دستاویز کو ''مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پی پی پی کا طرزِ عمل'' کا نام دے دیتی۔ صرف میری حکومت اور میری پارٹی کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ۳۴۳ دستاویزوں میں سے ایک بھی پی این اے کی انتخابی سرگرمیوں سے متعلق نہیں۔ کراچی، حیدرآباد، میرپور خاص، سکھر، رحیم یار خان، ملتان، ساہیوال، لاہور، سرگودھا، فیصل آباد، سیالکوٹ، گجرات، گجرانوالہ، کوئٹہ، پشین، مردان، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور بہت سی دوسری جگہوں پر پی این اے کی سنگین دھاندلیوں میں سے ایک بھی واقعہ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ پی این اے کی ایک دستاویز تک کا ذکر نہیں، اس اپیل کا بھی نہیں جس میں مسلح افواج کو بغاوت کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔

پی این اے کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے وقت، (اگرچہ وائٹ پیپر کے حساب سے وہ قابلِ توجہ نہیں) میں جنوری ۱۹۷۷ میں قومی اسمبلی میں اپنی اس درخواست کا حوالہ دوں گا۔

''مجھے امید ہے کہ آئندہ انتخابات منصفانہ اور صاف ستھرے

ہوں گے مگر صرف میری یقین دہانی کافی نہیں۔ دوسری جماعتوں کو بھی اس خواہش اور پالیسی کا جواب دینا چاہیے۔ دوسرے فریق کو عملی طور پر ظاہر کرنا چاہیے کہ وہ جانتا ہے صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات کیسے ہوتے ہیں......"

میں نے قومی مفاد کی خاطر خیر سگالی کے اظہار کی اپیل کی تھی۔ پی این اے کی اس خیر سگالی کی چند مثالیں پیش ہیں:

(1) اصغر خان نے انتخابات سے بہت پہلے متعدد مواقع پر یہ دعویٰ کیا کہ اپوزیشن الیکشن جیت چکی ہے اور ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو صرف اس کی رسمی تصدیق باقی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ پی این اے ریڈیو سے نشر ہونے والے کسی ایسے انتخابی نتیجے کو تسلیم نہیں کرے گی جس میں پی این اے کی کامیابی سے مختلف کوئی اطلاع ہو۔ اس امر کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ پی این اے کا منصفانہ انتخابی مقابلے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا؟

(2) عام انتخابات سے ایک ہفتہ قبل ملک کو مفلوج کرنے کے لئے پی این اے کے لیڈروں نے عام ہڑتال کی اپیل کر دی۔ کافی افراتفری مچی۔ کراچی میں ٹریفک روکنے کے لئے دو بسوں کا جلانا کافی ہوتا ہے۔ پی این اے کے حامیوں نے عوام کو ہراساں کیا۔ پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی جائیداد پر حملے کئے گئے' تا کہ ان کی انتخابی مہم متاثر ہو۔ پی این اے کے کارکنوں نے پارٹی کے جھنڈے جلا کر اور ہلڑ بازی کر کے پیپلز پارٹی کے جلسے الٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پیپلز پارٹی

کی خواتین کارکنوں کے جلوس کی شرکاء کو گندی غلیظ گالیاں دی گئیں۔ پنجاب میں گجرانوالہ، ڈسکہ اور سیالکوٹ میں تشدد آمیز حملے کئے گئے۔

(3) پی این اے پاگل ہوگئی تھی...... مجھے وفاقی وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ کی کراچی کے حالات کے بارے میں چیف الیکشن کمشنر سے کی گئی شکایت کی ایک کاپی ملی۔ انھوں نے بیان کیا تھا کہ کس طرح پی این اے کھلم کھلا ''غنڈہ گردی، بدمعاشی اور تشدد'' کا مظاہرہ کر رہی ہے اور پیپلز پارٹی کے خلاف ''غلیظ اور اشتعال انگیز زبان'' استعمال کر رہی ہے اس نے ایک ایسی گھٹیا مہم شروع کر رکھی تھی جو متعدد انتخابی قوانین کی سراسر خلاف ورزی تھی۔

(4) خود انتخابات کے دن، ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو وسیع دھاندلی کے علاوہ پی این اے نے غنڈہ گردی کا مزید مظاہرہ کیا۔ کراچی شہر میں خاتون ووٹروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کئی پولنگ سٹیشنوں پر مسلح حملے کئے گئے۔ پیپلز پارٹی کے دو کارکن گولیوں کا نشانہ بن گئے اور آٹھ زخمی ہو کر ہسپتال پہنچے۔ ملیر توسیعی کالونی، کورنگی، پی آئی بی کالونی اور لیاقت آباد میں پیپلز پارٹی کے انتخابی دفاتر کو آگ لگا دی گئی۔

(5) انتخابات کے بعد پی این اے کا ایجی ٹیشن بھی انہی خطوط پر چلایا گیا۔ انتخابات سے پہلے پھیلائے گئے انتشار سے ان کی تسلی نہ ہوئی تھی وہ اپنی محنت کے پھل سے مطمئن نہ تھے۔ وہ بالکل پاگل یعنی بقول امریکنوں کے ''وحشی'' ہو گئے۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ چیف الیکشن کمشنر کے دونوں صاحبزادوں آصف سجاد اور وسیم سجاد کی بیویاں انتخابات کے نتائج کے خلاف نکالے جانے والے جلوسوں کی قیادت کرتی رہیں۔

یہ چند مثالیں ناشائستگی کی محض نشانی کے طور پر پیش کی گئی ہیں انتہائی سنگین اشتعال انگیزی کے باوجود حکومت نے اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا۔ ہم ''وحشی'' نہیں ہوئے۔

اپوزیشن کی ''نیت اور پالیسی'' ایک صاف ستھرا اور منصفانہ الیکشن لڑنے کی تھی ہی نہیں۔ یہ ایک ایسی عریاں حقیقت ہے جو فاتر العقلوں پر بھی عیاں ہے۔ پی این اے کے کرتوتوں کی داستان وائٹ پیپر سے غائب ہونے کی وجہ سے مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ لارڈ نیلسن کی دوسری آنکھ بھی بند کرنے سے زیادہ یک طرفہ حرکت ہے۔ حکومت نے دوہرے معیارات کی دوہری خوراک استعمال کی ہے۔

انتخابات کے ضمن میں وائٹ پیپر میں بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں انتخابات کو اپوزیشن سے ایک طرح کی جنگ سمجھ رہا تھا۔ ''مارو یا مرجاؤ منصوبے'' کے عنوان سے صفحہ ۱۱ پر کہا گیا ہے:

> ''اپنے انتظامی مزاج کے عین مطابق مسٹر بھٹو نے آئندہ انتخابات کو اپوزیشن کے خلاف جنگ سمجھ رکھا تھا۔ ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:
> 'مختصر یہ کہ ایک جنگی منصوبہ ہوگا جس میں کسی بات کو اتفاقات پر نہیں چھوڑا جائے گا۔ ہمیں دشمن کے خلاف ایسی مہم شروع کرنا ہے جس میں ہم اپنے مضبوط پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے کمزور پہلوؤں پر حملہ کریں'۔ یہ جنگی اصطلاحیں مسٹر بھٹو کی تقریروں' ان کے اور ان کے معتمد ساتھیوں کے تیار کئے گئے منصوبوں میں بار بار نظر آتی ہیں۔''

۷ جنوری ۱۹۷۷ء کی قومی اسمبلی کی تقریر میں عام انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:

''میں جانتا ہوں کہ سیاستدان انتخابات سے اسی قدر پہلوتہی
کرنا چاہتے ہیں جس قدر جرنیل جنگ سے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سیاسی
جنگیں، سیاسی انتخابات ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق لڑے جاتے ہیں جبکہ
جنگوں کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا۔''

میری تقریر کا یہ حصہ وائٹ پیپر کے پیش لفظ کے صفحہ (iii) پر نظر آتا ہے۔ کوئی جاہل ہی ان استعاروں سے لفظی مطلب اخذ کرے گا، جب تک کہ مقصد ہی مجھے بدنام کرنا، میرے خلاف تعصب اور نفرت کو ہوا دینا نہ ہو۔ ''مارو یا مر جاؤ''، ''کوئی بات اتفاقات پر اٹھا نہ رکھو'' محض عزم اور منصوبہ بندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صوبے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے فرمایا ہے کہ اناج کی پیداوار کے کام کو ''جنگی خطوط'' پر کیا جانا چاہیے۔ کیا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو سیاسی کیریئر کے لئے اپنے فوجی پیشے کو خیر باد کہنے والے یہ جنرل صاحب جنگی جنون میں مبتلا ہیں؟ دنیا بھر میں سیاسی رہنما تحریروں اور تقریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ سیاسی عمل کو تیز تر اور رواں کیا جا سکے۔ سیاست سب سے لطیف فن اور سب سے تخلیقی پیشہ ہے۔

کوئی قابلِ ذکر سیاست دان ایسا نہیں جس کے جارحانہ الفاظ سے جرنیلوں کو کوئی خطرہ درپیش ہو، البتہ اس کا الٹ سچ ہے، کم از کم پاکستان میں۔ ہمارے ہاں شہری حکومت کے زمانے میں، جرنیل جمہوریت کے گن گاتے ہیں اور آئین سے وفاداری کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہ سیاسی حکومت کی عاجزانہ وفاداری کا دم بھرتے ہیں، صرف اس لئے تاکہ وقت آنے پر اس کا تختہ الٹ سکیں اور اقتدار پر قابض ہو سکیں۔

موجودہ حکومت کو میری جنگی اصطلاحوں پر تنقید کر کے یا میری جنگ اور سیاست کی تشبیہہ پر زور دے کر خود اپنی شرمندگی کا سامان نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تو نو سال کی عمر میں ہی ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے بہت بڑا سبق سیکھ لیا تھا۔ اور اتفاقات پر کوئی بات چھوڑنے اور ضرورت سے زیادہ خوش فہمی کا شکار ہونے کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس کا کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں کہ بدعنوانی

یا دھاندلی کا جواز فراہم کیا جائے۔ اس کے برعکس مکمل منصوبہ بندی کا مطلب ہی یہ ہے کہ دھاندلی یا فریب زیرِ غور نہیں۔ جنگ کی طرح انتخابات کے بھی اپنے اصول اور قواعد ہوتے ہیں۔ ایک اچھا جرنیل مکمل منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ اپنی افواج کو فتح سے ہمکنار کرتا ہے۔ اور جو جرنیل خراب اور سطحی یا بغیر منصوبے کے جنگ میں کود پڑتا ہے۔ یقیناً اپنے نوے ہزار (۹۰،۰۰۰) سپاہیوں کو دشمن کے حوالے ہی کرتا ہے۔ ایسا جرنیل جو اپنے منصوبے تیار رکھے' اپنے نائبین سے مشورہ کرتا رہے' قابلِ قبول یا نا قابلِ قبول' تمام تجاویز پر غور کرے اور ہر طرح سے تیار ہو...... وہ اپنی فوجوں اور اپنے ملک کے لئے فخر کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے جرنیل کو جنگی قوانین یا اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ درحقیقت وہ جتنا زیادہ تیار ہوتا ہے' اتنا ہی جنگی قواعد اور اصولوں کی خلاف ورزی کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں۔

میں نے جنگی زبان میں یہ ساری بات اس لئے کی ہے تا کہ فوجی حکومت اور اس کے شرکائے کار پر واضح ہو کہ جتنا وہ مجھ پر مکمل منصوبہ بندی اور تیاری کا الزام لگاتے ہیں اتنا ہی مجھے دھاندلی کے الزام سے بری الذمہ کرتے جاتے ہیں۔ کم عقل سے کم عقل اور انتہائی کند دماغ شخص کی بھی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ اگر مجھے انتخابات میں دھاندلی کرنا ہی ہوتی تو میں ماڈل پلان نہ بناتا' معلومات کا انبار جمع نہ کرتا اور انتخابات کی تیاریوں کے لئے طویل میٹنگوں میں شریک نہ ہوتا۔ اگر میرے ذہن میں دھاندلی ہوتی تو ایک دو اجلاس' ایک دو چھوٹے موٹے احکامات کافی ہوتے۔ یہ حقیقت کہ اس کام کے لئے پے در پے چارٹ' سکیمیں اور منصوبے تیار کئے گئے' کنٹرول روم بنائے گئے اور مواصلاتی رابطے قائم کئے گئے' یہ ثابت کرتی ہے کہ میری حکومت اور پارٹی ''جنگ'' لڑ کر جیتنا چاہتی تھی' بغیر لڑے نہیں۔

اگر میرا مقصد دھاندلی ہوتا تو میں رات رات بھر میٹنگوں میں قیمتی وقت ضائع نہ کرتا۔ ہم اپوزیشن کے ہر الزام اور اقدام کا اندازہ لگا کر اس کے جوابی اقدامات کی تیاری کر رہے تھے۔ طویل اور تھکا دینے والے انتخابی دوروں کے منصوبے بنائے گئے اور ان پر عمل بھی ہوا۔ صوبائی سیل قائم کئے گئے' پارٹی کی تنظیم نو کی گئی۔ ہر پہلو کو مدنظر رکھا گیا۔ اور اپنی تمام تر قوت سے میں نے

ایک منصفانہ اور صاف ستھرا الیکشن لڑنے کی کوشش کی۔ اگر میں نے دھاندلی کرنی ہوتی تو ایسی مفصل اور صبر آزما تیاریوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ میں ساری مہم کو 'مسعود محمود زدہ' کر دیتا اور خود اپنے آبائی قصبے' میں جا کر بطخوں کا شکار کھیلتا اور موسیقی اور مزے کے لئے ''ماڈل پلان' بناتا۔ لیکن میں تو ایک غلام کی طرح بہتر سے بہترین کے لئے جدوجہد کرتا رہا جیسے اجتماعی بہبود کے ہر کام کے لئے میرا وطیرہ رہا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں نے سرکاری اہلکاروں کو انتخابی مہم کے لئے استعمال کیا اور جس قدر سفر کیا' وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے اس کا صرف ۲۵ فیصد جائز تھا' باقی ناجائز۔ حقیقت کو بری طرح مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

احمقانہ الزامات ایجاد کئے گئے ہیں۔ میں موت کی کوٹھری میں بند ایسے الزامات کو پرزے پرزے کرنے سے معذور ہوں۔ اگر میں آزاد ہوتا بھی اور تمام سرکاری ریکارڈ میری دسترس میں ہوتا تب بھی میں اس داستان کے ہر افسانے کا ذکر کرنا اپنی توہین سمجھتا۔ بہتر حالات میں چھوٹے چھوٹے الزامات کو نظر انداز کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے کبھی سپر سیلون میں سفر نہیں کیا' مگر صفحے کے صفحے اس سلسلے میں کالے کئے گئے ہیں اور اینٹی کلائمکس تب آتا ہے جب آخر میں یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ اپوزیشن کی دھمکیوں سے ڈر کر میں نے سیلون استعمال ہی نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے میرے ہم وطن مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ میں ایسی مضحکہ خیز توجیہات کا جواب دوں۔

جہاں تک سرکاری ملازموں کو ہراساں کرنے کا تعلق ہے' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کوئی خلاف ورزی نہیں کی گئی تھی' میں صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ صفحہ ۸۷ اور ۸۸ پر کراچی کے عظیم جلوس کا ذکر ہے۔ جلوس کی قیادت کرنے کے لیے میری کراچی آمد پر کراچی ایئرپورٹ پر عوام کا ایک سمندر امڈ آیا تھا۔ چیف آف آرمی سٹاف اپنی وردی کی وجہ سے ہجوم میں سے پہچانا جا سکتا تھا۔ ہجوم کی وجہ سے میں اس سے ہاتھ تو نہیں ملا سکا' مگر اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ (جو اب کافی عام ہو چکی ہے) کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ہلا کر میرا استقبال کیا تھا۔ اس کا جواب اس امر پر منحصر ہے کہ ڈنڈا کس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وائٹ پیپر کا سبق ہے۔

میری ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم بھی بالکل انہی اصولوں کے مطابق منظم کی گئی تھی۔ المرتضیٰ کا

مہمان خانہ کنٹرول روم تھا۔ ویسے ہی پلان چارٹ، سیل، اور تجزیے تیار کئے گئے تھے۔ ویسے ہی دوروں کا منصوبہ بنایا گیا اور ان پر عمل کیا گیا۔ انہی رفیع رضاؤں، پیرزادوں اور کھروں کو خصوصی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ چونکہ ہم نے انتخابات پوری تیاری سے لڑے تھے، اس لئے ہم نے یحییٰ خان کی دھاندلی کا مقابلہ کیا اور اسے ناکام بنا دیا۔ چونکہ ہم انتخابی ''جنگ'' میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر کودے تھے، ہمارے جنگی منصوبے تیار تھے ''مارو یا مر جاؤ'' کا جذبہ موجود تھا، اس لئے ہم بحرانوں، سازشوں اور سانگھڑ جیسے قاتلانہ حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے قابل تھے۔ ہم تمام رکاوٹوں کے باوجود ۱۹۷۰ء میں فتح مند ہوئے۔ اسی ناقابلِ تسخیر جذبے کے باعث ۱۹۷۷ء میں بھی ہم کامران ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں بھی میں نے اتفاقات پر انحصار نہیں کیا تھا۔ میں نے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا۔ میں جھاڑو کشوں کی جھگیوں میں گیا۔ کچی آبادیوں کے جھونپڑوں میں گیا۔ ہر جگہ میں نے قدموں کے نشان چھوڑے میری آواز گھر گھر پہنچی۔

ایک گاؤں ایسا بھی تھا جس میں میں تین مرتبہ گیا۔ چونکہ اس گاؤں میں ایک پیر کے وراثتی اثر و رسوخ کی وجہ سے میرے ذہن میں شبہ باقی تھا، اس لئے وہاں چوتھی مرتبہ گیا۔ تب گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا۔ ''سائیں، آپ ہمیں اس قدر شرمندہ کیوں کر رہے ہیں؟ ہم اور کس کو ووٹ دے سکتے ہیں؟''

اور میں نے دیکھا کہ صرف میری ہی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ یہ ایک گاؤں تھا جو صدیوں میں پہلی مرتبہ ایک گنہگار سیاستدان، نہیں ایک سزائے موت کے مجرم کے لئے ایک پیر کو خیر باد کہہ رہا تھا۔

جب میری جیپ روانہ ہو رہی تھی تو دور تک ''جئے بھٹو'' کے نعروں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ شاید میں اس سرزمین کے غریبوں کے دلوں کی ان گہرائیوں تک پہنچ گیا ہوں، جس کا دوسرے ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اس گھر میں جس کی چھت بارش میں ٹپکتی ہے، میں گھر کا ایک فرد بن چکا ہوں۔ میرا تعلق اس زمین کے پسینے سے، اس کے دکھوں سے ہے۔ میرا اس کے عوام سے ایسا گہرا ابدی رشتہ ہے جسے کوئی فوج کبھی نہیں توڑ سکتی۔

9......

دھاندلی یا تنظیم

یہ کہا گیا ہے کہ میں نے ہدایات دی تھیں کہ پی این اے اور این ڈی پی کے سربراہ کو کسی قیمت پر جیتنا نہیں چاہیے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ دونوں اپنے اپنے حلقوں سے خاصی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

مزید یہ کہ چیف سکریٹریوں کے بیانات میں اصرار ہے کہ میں نے یا کسی اور نے انتخابات میں دھاندلی کی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ میں وہ فقرہ دہراتا ہوں' جو میں نے تب کہا تھا۔

''میں کسی ایک دن وہ غلطی نہیں کرنا چاہتا جس کے باعث مجھے آئندہ پانچ برس تک پچھتانا پڑے۔''

وائٹ پیپر میں افسر شاہی کو انتخابی سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کے لنگڑے لولے الزامات بھی دھاندلی کی نشاندہی نہیں کرتے اب میں انتخابات کرانے کی قدر و قیمت سے انتخابات کرانے کے وعدے کے بہانے اقتدار پر قبضہ کر کے مکر جانے کی طرف آتا ہوں۔

یہ خیال احمقانہ ہے کہ اکثریتی جماعت کو انتشار کا شکار کرنے یا خاموش ہونے پر مجبور

کرنے کے بعد انتخابات کرا دیئے جائیں گے۔ نااہلیوں کے ٹریبونل بھی دھاندلی کی ایک شکل ہیں۔ دفاع کا کوئی موقع دیئے بغیر یک طرفہ نااہلیاں فیصلے کا وقت آنے سے پہلے ممکنہ مخالفین کو راستے سے ہٹانے کا ایک حربہ ہیں۔ جب پیپلز پارٹی کے تمام امیدوار نااہل قرار پا چکیں گے تو کیا اس کے بعد فوج یہ سمجھتی ہے کہ وہ مثبت نتائج حاصل کر سکے گی؟

جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر نئی انتخابی فہرستوں کی تیاری اس فریب کا ایک اور رُخ ہے۔ آئین کے تحت انتخابی فہرستوں پر ہر سال صرف نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں میں آئینی تقاضے پورے کئے بغیر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں مخلوط انتخابات سے جداگانہ انتخابات کی طرف تبدیلی آئین کی روح اور الفاظ دونوں کے منافی ہے۔ مگر فوجی حکومت نے تو آئین کو کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا ہے' حالانکہ مارشل لاء کو آئین سے بالاتر اقدام کے طور پر جواز صرف اور صرف نظریۂ ضرورت اور موجودہ آئین کے تحت جلد سے جلد انتخابات کرانے کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ خود کو صرف خدا کے سامنے جواب دہ سمجھنے والے ان افراد کا سیاسی اقتدار پر قبضہ عوام کی رضا کے سراسر منافی ہے۔ یہ دھوکہ دہی ہے' دھاندلی ہے۔

فریب کی ایک اور مثال یہ دعویٰ ہے کہ سرکاری ملازموں اور انتظامیہ کی شرکت دھاندلی ہے۔ انتخابات کے عمل سے ان کو الگ تھلگ رکھنا ممکن نہیں۔ سرکاری اہلکاروں اور انتظامیہ کی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ:

1- امن وامان قائم رہے۔
2- کوئی بدعنوانی نہ ہو۔
3- انتخابات منظم طریقے سے ہوں۔
4- عورتوں کو پولنگ اسٹیشنوں پر ہراساں نہ کیا جائے۔
5- امیدوار انتخابات اور پولنگ کے قواعد کی پابندی کریں۔
6- بیلٹ بکسوں کا تقدس برقرار رہے۔

-7 کوئی بہروپ بازی نہ ہو۔ جعلی ووٹ نہ ڈالے جائیں۔

یہ فہرست طویل ہے۔ انتظامیہ اور سرکاری اہلکاروں کے بغیر کسی انتخابات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے تمام تر دیانتداری سے انتخابی تیاریوں کے منصوبوں میں کچھ سرکاری افسروں کی شمولیت کی تجویز تھی۔ مگر بعد میں مزید غور کے بعد اس پر عمل نہ کیا گیا۔

اس سلسلے میں صفحہ ۶۱ پر الزام لگایا گیا ہے:

- ''مسٹر زیڈ اے بھٹو نے ۱۹۷۴ء سے عام انتخابات کے لئے انتظامی ڈھانچہ تشکیل دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں انتظامی محکموں کے لئے مخصوص کام تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ مرحوم صدر ایوب خان کی کابینہ میں وزیر اور ان کی کنونشن مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل تھے، تب سے وہ اپنی پارٹی کے اراکین اور عہدے داروں کا ضلعی افسروں کے طور پر تقرر کروانے کے لئے مشہور تھے۔''

گورنمنٹ ہاؤس ڈھاکہ کی ایک محدود میٹنگ میں میرے ریمارکس کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت صدر ایوب نے کی تھی اور اس میں سرکاری افسروں، جن میں دونوں صوبوں کے گورنر، اس وقت کے لاء سکریٹری مولوی مشتاق حسین شامل تھے۔ آج انہی لاء سکریٹری صاحب نے اپنے وائٹ پیپر میں اس اجلاس کی گمراہ کن رپورٹ پیش کی ہے۔ یہ غلط ہے کہ میں نے ایسی کسی تجویز کی حمایت کی تھی۔ میں نے صرف ایشیا میں رائج مختلف نظاموں کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ پیش کیا تھا اور اپنے عوام کے تقاضے پورے کرنے اور استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں ان کی استعداد کا جائزہ لیا تھا۔ یہ ایشیائی منظر کا سیاسی سروے تھا۔ بلاشبہ میں نے پاکستان میں مروج نظام کی تاریک تصویر پیش کی تھی اور اس کی اندرونی خامیوں کی نشاندہی کی تھی۔ میں نے افسر شاہی یا اس کے بڑے بھائی فوج کے بارے میں کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ ایسی کوئی کوشش بلا مقصد ہوتی۔ اس اجلاس کے اکثر شرکاء بنگلہ دیش میں ہیں یا انتقال کر چکے ہیں۔ صرف سابق وفاقی لاء سکریٹری اور میں ایک شہر میں دو مختلف کہانیاں بیان کرنے کے لئے زندہ ہیں۔

انتخابات کی حد تک اصل معرکہ پنجاب میں تھا۔ پی این اے نے بلوچستان میں انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ان کے رہنماؤں نے کراچی کے مضبوط مورچے اور سرحد میں کامیابیاں حاصل کی تھیں فوجی اہمیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا پانی پت تھا۔ جو پانی پت میں غالب آتا' فتح اس کی تھی۔ ۲۱۷ رکنی قومی اسمبلی میں پنجاب کی ۱۲۱ نشستیں تھیں۔صوبہ وار تقسیم یوں تھی۔

بلوچستان: ۴۰

سرحد: ۸۰

پنجاب: ۲۴۰

سندھ: ۱۰۰

تین دوسرے صوبوں کی اسمبلیوں کی مشترکہ رکنیت پنجاب اسمبلی کے کل اراکین سے ۲۰ کم تھی۔ وفاقی اسمبلی میں بھی یہی پوزیشن تھی۔ چنانچہ اگر دھاندلی درکار ہوتی تو اس کی ضرورت مالاکنڈ یا مری بگتی کے قبیلوں میں نہ تھی بلکہ پنجاب کے میدانوں میں کھلے عام ہوتی پنجاب محوری صوبہ تھا۔ اگر پنجاب میں دھاندلی ثابت نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں بھی نہیں ہوئی۔ پیپلز پارٹی نے اس صوبے میں واضح اکثریت حاصل کی تھی۔ بغیر دھاندلی کے' کیونکہ خود وائٹ پیپر میں پولنگ کے دن سے متعلق ۳۴ صفحات میں سے صرف چار صفحات اس بارے میں ہیں۔

اگر کسی قسم کی دھاندلی ہوئی ہوتی تو یہ ناممکن ہے کہ وائٹ پیپر ایسی شہادت پیش کر پاتا جو الٹا مجھے اور میری حکومت کو الزامات سے بری ظاہر کرتی۔ ان چار صفحات میں متضاد اور غیر متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے انکوائری کمیٹی نے ۲۰۰ افسروں کے جو بیانات جمع کئے تھے۔ ان میں سے جن دو کو اہم ترین سمجھا گیا' وہ پیپلز پارٹی پر ''وسیع پیمانے پر دھاندلی -- مرکزی منصوبہ یا ہدایت۔'' کے سلسلے میں کوئی الزام نہیں لگاتے۔ ایک بیان سابق ڈپٹی کمشنر لائل پور نوید آصف نے

دیا تھا جو وائٹ پیپر کے صفحہ ۳۱۹ پر درج ہے:

وہ صفحہ A-914 پر کہتا ہے:

''میں نے ایسا کوئی موقع یاد کرنے کی بہت کوشش کی ہے' جب کمشنروں یا پولیس افسروں کے ساتھ میٹنگوں میں مجھے یہ ہدایت دی گئی ہو کہ پیپلز پارٹی کے امیدواروں یا حامیوں کی طرف سے قانون کی کھلی خلاف ورزی کو نظر انداز کیا جائے۔ مگر انتخابی مہم یا انتخابات کے روز تک ایسا کوئی واقعہ مجھے یاد نہیں۔''

صفحہ A-919 پر وہ مزید کہتا ہے:

''مجھے کسی حلقے سے غیر تصدیق شدہ بیلٹ پیپر موصول نہیں ہوئے۔ نہ ہی کسی امیدوار کی طرف سے تحریری شکایات ملیں۔ کسی نے ووٹوں کے بیگ میں ردوبدل کی شکایت نہیں کی اور نہ ہی کسی حلقے یا پولنگ سٹیشن سے کبھی ایسی کوئی زبانی شکایت بھی کی گئی۔''

دوسرا سرکاری افسر ڈی آئی جی پولیس محمد اصغر خان ہے۔ یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ وہ مقدمہ قتل میں بھی گواہ ہے۔ سپریم کورٹ کے سامنے اپنے حلفیہ بیان میں سابق آئی جی پولیس راؤ عبدالرشید گھٹیا اور افسروں کے لئے غیر موزوں رویے کی شکایات موصول ہونے کی بعد اصغر خان کے بحیثیت پولیس افسر کردار کے بارے میں سخت منفی رپورٹ دیتے ہیں۔ اپنے بیان میں اصغر خان پولنگ کے روز کی غلط کاریوں کی بات نہیں کرتا۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں اور جو کچھ وہ کہتا ہے' اس کی صوبے کی چیف سکریٹری (جسے وائٹ پیپر' کلیدی افسر' قرار دیتا ہے) کے بیان سے نفی ہو جاتی ہے۔ پنجاب کا چیف سکریٹری ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھا۔ وہ میری ۱۹۷۲ء کی اسکیم کے تحت لیٹرل انٹری نہ تھا۔ جنگ میں اس کی آنکھ بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ اس کا تعلق بھی چیف آف آرمی سٹاف والی مشکوک شہرت کی حامل رجمنٹ ہی سے تھا۔ بریگیڈیئر کو اس کی جرأت اور قابلیت کے صلے کے طور پر سول سروس میں معقول وجوہات کی بنا پر لے لیا گیا تھا۔

جب ۱۹۷۱ء کے موسم گرما میں ڈاکٹر ہنری کسنجر چین کے خفیہ دورے کے سلسلے میں پاکستان آئے تو اسی بریگیڈیئر کو نگرانی کے لئے مامور کیا گیا تاکہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔ میں اس سے واقف نہیں تھا مگر صدر پاکستان کا عہدہ سنبھالنے کے ایک ماہ بعد اس کے فرائض کی انجام دہی کے دوران اس سے واقف ہوا۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد اسے سویڈن سفیر مقرر کر دیا گیا۔ اس نے فروری ۷۷ء میں اپنی بیوی کی المناک موت کے بعد غیر ملکی ذمہ داری کے لئے خود درخواست کی تھی۔ پروبین رجمنٹ کے اس ساتھی افسر کی درخواست کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بخوشی قبول کر لیا۔ تاہم پراسرار طریقے سے یہ تقرری اچانک منسوخ کر دی گئی۔ حالانکہ بریگیڈیئر کی قابلیت اور تجربے میں کوئی شک نہ تھا۔ شاید اس کا جواب وائٹ پیپر کے 'پنجاب کی صورت حال' والے حصے میں موجود ہے۔ میں اس کا اقتباس بلاتبصرہ نقل کرتا ہوں:

''پنجاب کی صورتِ حال''

پنجاب میں جو جنگ کا بڑا میدان تھا' گورنر کے خط کے علاوہ دوسرے شواہد ایسے ہیں جو سرکاری دلچسپی اور مداخلت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

سی ایم ایل اے کی تحقیقاتی کمیٹی کا ایک اہم گواہ بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) مظفر ملک تھا' جو انتخابات کے وقت پنجاب کا چیف سکریٹری تھا۔ اس سے قبل وہ مرکز میں وزارتِ داخلہ کے سکریٹری کے اہم عہدے پر بھی فائز رہ چکا تھا۔ اسے ''قومی تحفظ'' اور ''خفیہ سروس'' کا تجربہ تھا اور مضبوط وفاداریوں والے سخت گیر منتظم کی شہرت حاصل تھی۔

انکوائری کمیٹی کے سامنے اپنے مختصر اور جامع بیان میں جو ۲۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو دیا گیا' بریگیڈیئر مظفر ملک کہتے ہیں' (صفحہ ۲۷۷):

> انتخابی مقاصد کے لئے جو سیاسی مشینری پارٹی میں رابطہ اور توازن پیدا کرنے کے لئے استعمال کی گئی وہ کئی وزیروں پر مشتمل تھی جنھیں مختلف ڈویژنوں اور اضلاع کا انچارج بنایا گیا۔ گورنر' بہاولپور

ڈویژن کا ذمہ دار تھا جبکہ وزیراعلیٰ ذاتی طور پر ملتان ڈویژن کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے وزیر اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے مطابق ایک ایک یا دو دو اضلاع کے ذمہ دار بنائے گئے۔ اس کے علاوہ وزیراعظم نے پنجاب کے تمام اہم مقامات کا خود دورہ کیا۔ ان شہروں یا قصبوں کا انتخاب ان کی سیاسی اہمیت اور سیاسی رابطہ افسروں کی سفارشات کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اسی امر کا اندازہ لگانے کے لئے کہ پنجاب سے پیپلز پارٹی کتنی نشستوں پر کامیاب ہو گی' وزیراعلیٰ اور وزیراعظم کی سطح کے کئی اجلاس ہوئے۔ وزیراعظم کی میٹنگیں کابینہ کی سطح پر ہوتی تھیں جن میں صوبوں کی سیاسی اور انتظامی دونوں طرح کی نمائندگی ہوتی تھی۔ البتہ وزیراعلیٰ کی میٹنگوں میں' میں خود' ہوم سکریٹری' کمشنر' ڈی آئی جی اور وزیراعلیٰ کے اسٹاف کے بعض اراکین شریک ہوتے تھے۔ صوبائی سطح کی میٹنگوں میں ڈویژنل افسروں سے کہا گیا کہ وہ مختلف نشستوں پر کامیابی کے بارے میں جائزہ پیش کریں۔ خصوصاً نام نہاد اہم نشستوں پر یعنی وہ جہاں حکمران جماعت یا اپوزیشن کے اہم رہنما امیدوار تھے۔ مقصد یہی تھا کہ سیاسی اندازوں سے آزادانہ انتظامی اندازوں کا موازنہ کر کے مجموعی صورتحال کا جائزہ لیا جا سکے۔ ابتدائی مرحلوں پر انتظامیہ کے اندازوں کے مطابق ۸۰ نشستوں پر کامیابی یقینی تھی۔ جس وفاقی اجلاس میں میں شریک ہوا تھا اس میں وزیراعظم کو ۰ ے نشستوں کی اطلاع دی گئی تھی۔"

ان میٹنگوں سے پہلے' دوران یا بعد میں' کسی بھی مرحلے پر میری طرف سے کمشنروں کو ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی کہ وہ انتخابات کے نتائج کو حکمران جماعت کے حق میں کرنے کے لیے اثر انداز ہوں۔ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ پنجاب کے بعض حلقوں میں دھاندلی کے واقعات مختلف قسم کی بدعنوانیوں کے مرتکب امیدواروں کی انفرادی کارروائیوں کا نتیجہ تھے۔ ممکن

ہے انھیں ان مقامی افسروں کی پشت پناہی بھی حاصل رہی ہو جن کی تقریروں کا وہ سیاسی راستوں سے بندوبست کر سکے ہوں۔

بظاہر بریگیڈیئر ملک نے صرف جائزوں کے علاوہ اعلیٰ سطحی مداخلت کی تردید کی ہے۔ امیدواروں کی انفرادی دھاندلی کے واقعات کی ذمہ داری مقامی افسروں' پر عائد کی گئی ہے' یہ متعدد ڈویژنل اور ضلعی افسروں کی شہادتوں سے متصادم ہے۔ جنھوں نے براہِ راست چیف سکریٹری سے ہدایت ملنے کا ذکر کیا ہے۔ (صفحہ ۲۴۹)

صفحہ ۲۵۷ پر رقم ہے:

> بریگیڈیئر مظفر ملک نے شہادت کے دوران تسلیم کیا کہ اسے ''لاڑکانہ پلان'' اس وقت کے وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی نے دکھایا تھا۔ اس نے یہ بھی تصدیق کی کہ لاہور میں ایک کنٹرول روم قائم کیا گیا تھا جو بڑی مہارت اور باریک بینی سے چلتا تھا۔
>
> وزیر اعلیٰ کا انتخابی سیل بھی قائم تھا۔ ایسے ہی سیل اور کنٹرول روم کوئٹہ اور پشاور میں بھی کام کر رہے تھے۔''

اسے دھاندلی نہیں تنظیم کہتے ہیں۔ صوبے کا کلیدی انتظامی افسر جس کا مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اہم کردار تھا اور جو نہ صرف ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھا بلکہ اسی اعلیٰ ''پر دہینیز ہارسز'' کا ساتھی افسر تھا' کہتا ہے کہ ہم نے پنجاب میں انتخابات میں دھاندلی نہیں کی تھی۔ فریب کاری کا بوجھ ان کے پلڑے میں ہے' ہمارے میں نہیں۔

۱۰......

الیکشن کمشنز اور فوجی اصطبل

سابق چیف الیکشن کمشنر

وائٹ پیپر میں صفحے کے صفحے یہ ثابت کرنے کے لئے سیاہ کئے گئے ہیں کہ میں نے چیف الیکشن کمشنر کو کٹھ پتلی اور الیکشن کمیشن کو باندی بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ واضح کرنے کے بعد کہ موجودہ الیکشن کمیشن 'پروبین ہارسز' کے اصطبل کے لئے بھی کارآمد نہیں' میں آئینی دور کے الیکشن کمیشن اور ٹامی گن مارشل لاء کے عہد کے الیکشن کمیشن کا موازنہ کرکے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔

وائٹ پیپر نے چیف الیکشن کمشنر جسٹس سجاد احمد جان کے بارے میں بڑا ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے اس دستاویز میں حقیقت کو اپنی مرضی کا لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید سابق چیف الیکشن کمشنر موجودہ چیف الیکشن کمشنر کی طرح فوجی ٹولے کے اندرونی گروپ میں شامل نہیں۔ مگر یہ واضح نہیں ہوتا کہ حکومت انھیں مومن اور شریکِ کار سمجھتی ہے یا میری انتخابی دھاندلیوں کا شریکِ جرم۔ ان کے کردار کے بارے میں وائٹ پیپر میں کافی تضادات ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنی پوزیشن واضح کردوں صفحہ ۳۷ پر الیکشن کمیشن کے

سکریٹری اے زیڈ فاروقی نے 'سنی سنائی' کی بنیاد پر مجھ پر الزام تراشی سے ہٹ کر ایک جگہ وائٹ پیپر تیار کرنے والوں سے یہ کہہ ہی دیا ہے کہ:

''۷ مئی ۱۹۷۵ء کو ہونے والے کابینہ کے اجلاس میں جس میں وہ خود سکریٹری الیکشن کمیشن کی حیثیت میں موجود تھا۔ چیف الیکشن کمشنر کے عہدے کی شرائط اور مستقبل کے عہدے داروں کی مراعات کی تفصیلات سننے کے بعد وزیراعظم نے کہا:

''اگر اس بدمعاش کو اتنی مراعات میسر ہیں تو اس کے جانشینوں کو کیوں نہ ملیں۔'' (صفحہ ۳۸)

اگر اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ سجاد احمد جان کے جانشینوں کو ویسی ہی مراعات ویسا ہی (بدمعاش) ہونے کے سبب دی جائیں تو میں پیغمبرانہ بصیرت کا دعویٰ کرسکتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس اجلاس میں یا کابینہ کے کسی اور اجلاس میں سجاد احمد جان کو 'بدمعاش'' کہا ہو۔ میں ایسا غیرمحتاط نہیں ہوسکتا تھا۔ آخر وہ چیف الیکشن کمشنر تھا جسے میں جیتنے کی کوشش کررہا تھا کہ اپنے گھٹیا منصوبوں پر عمل درآمد کرسکوں۔ یوں بھی وہ 'سیزر کی بیوی کو'' ملکہ ترنم'' کا تاج پہنانے میں کامیاب ہوچکے تھے جبکہ مارک انٹنی تین مرتبہ خود سیزر کا تاج پہننے میں ناکام رہا تھا۔ تاہم مجھے یہ ضرور تسلیم ہے کہ عبدالحفیظ پیرزادہ سے نجی گفتگو میں میں نے اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر کے بارے میں زیادہ مناسب اور دلچسپ الفاظ استعمال کئے تھے' خصوصاً اس لئے کہ وائٹ پیپر نے بجا طور پر (جو باعثِ حیرت ہے) یہ نشاندہی کی ہے کہ مسٹر حفیظ پیرزادہ کے مسٹر سجاد احمد جان سے بہت'' دوستانہ مراسم'' تھے۔

میرے چاک و چوبند نائب' حفیظ پیرزادہ سے انتہائی دوستانہ مراسم کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چیف الیکشن کمشنر نے اپنے استعفےٰ کے لئے اپوزیشن کے بڑھتے ہوئے مطالبے کو بڑی حقارت اور شاید صاف ضمیر کے ساتھ مسترد کردیا تھا۔ اگر وہ اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے تھے یا میری مبینہ دھاندلی سے ناراض تھے تو اپوزیشن کے مطالبے کا خیرمقدم

کرتے اور احتجاجاً استعفیٰ دے دیتے۔ چونکہ دھاندلی نہیں کی گئی تھی۔ اور چونکہ چیف الیکشن کمشنر بدمعاش نہیں تھے' اس لئے انھوں نے ایجی ٹیشن کا سہارا لے کر اپوزیشن کا ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو انھوں نے اپنے استعفیٰ کے لئے اپوزیشن کے مطالبے کو 'سیاسی بلیک میل' قرار دیا۔ وائٹ پیپر اس بارے میں صفحہ ۲۸ پر رقم طراز ہے:

''۶ مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے فوراً بعد ابلنے والے احتجاج نے اپوزیشن کے اس مطالبے کو جنم دیا کہ چیف الیکشن کمشنر استعفیٰ دے دیں۔ چیف الیکشن کمشنر کا ابتدائی ردعمل اس مطالبے کو نظر انداز کرنے کا تھا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے استعفیٰ کے مطالبے کو سیاسی بلیک میل قرار دے کر مسترد کر دیا اور کہا کہ سیاسی دباؤ کے تحت ان کا استعفیٰ 'عدالتی بدعنوانی' ہوگی۔ مگر جب احتجاج کا سلسلہ بند نہ ہوا تو تین ماہ کے اندر اندر چیف الیکشن کمشنر کو سرکاری خرچے پر علاج کے لئے رخصت پر ملک سے باہر جانا پڑا۔''

جب جنوری ۱۹۷۷ء میں میں نے موصوف کی میعاد میں مزید تین سال کی توسیع کی تھی تو مجھے اس فیصلے کے اچھے بُرے اثرات کا پتہ تھا۔ میں عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے اپوزیشن سے قریبی تعلقات تھے' خصوصاً گجرات سے تعلق رکھنے والے ایک سیاستدان سے۔ مجھے علم تھا کہ وہ ایک بہادر جنگجو ہونے کا روپ دھارے ہوئے ہیں اور اپوزیشن کو ''آزاد'' یعنی ان کے ساتھ ہونے کی یقین دہانیاں کراتے ہیں۔ اس لئے بار بار یہ وعدہ کیا کہ میری حکومت کی طرف سے معمولی سے معمولی مداخلت پر بھی وہ اسی لمحے استعفیٰ دے دیں گے۔ اس کی تصدیق سکریٹری الیکشن کمیشن مسٹر اے۔ زیڈ فاروقی کے ضمنی بیان سے بھی ہوتی ہے' جو وائٹ پیپر کے صفحہ ۳۷ پر درج ہے۔ وہ کہتا ہے:

''جناب سجاد احمد جان پر شدید دباؤ تھا اور وہ اکثر استعفیٰ دینے کا سوچا کرتے تھے۔''

ان حالات میں اگر میں انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے ان کی ملازمت میں توسیع نہ کرتا تو بہت شور مچتا۔ جیسے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنا چیف الیکشن کمشنر اپنے ہی آبائی قصبے سے چنا ہے، ویسے ہی اگر میں بھی لاڑکانہ سے کسی کو یہ عہدہ دے دیتا تو زبردست تنقید ہوتی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ الیکشن کمیشن میں ایک آزاد اور غیر جانب دار ادارے کے طور پر عوام میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے میں نے ملازمت میں توسیع کی منظوری دے دی۔ مگر تنقید پھر بھی ہوئی۔ اپوزیشن کی طرف سے نہیں، میرے اپنے ساتھیوں اور حامیوں کی طرف سے۔ اپوزیشن جماعتوں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ اس فیصلے پر تنقید کی واحد مثال کراچی کے اردو رسالے ''الفتح'' سے ملتی ہے۔ اور تنقید ایسے انداز سے کی گئی ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وائٹ پیپر کے صفحہ ۲۷ پر کہا گیا ہے کہ کراچی کے 'پاکستان اکانومسٹ' نے ۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء کے شمارے میں الفتح کا مضمون شائع کیا۔ اس حکومت نے گذشتہ آٹھ ماہ میں ''الفتح'' کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے بعد اسی رسالے سے میرے خلاف حوالہ دینا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے! لیکن اگر ملازمت میں توسیع نہ کی جاتی تو حکومت کو ناانصافی کے ثبوت پیش کرنے کے لیے مضامین اور بیانات کا انبار دستیاب ہو جاتا۔

اگر چیف الیکشن کمشنر میرے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتے تو وہ ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کی پریس کانفرنس میں یہ نہ کہتے کہ وہ مطمئن ہیں کہ انھوں نے ایک سکہ بند مشینری فراہم کر دی ہے۔ ''لیکن اگر 'لٹیرے'، ڈاکو اور غنڈے اس مشنری میں سوراخ کرنا چاہتے ہیں، تو کمیشن کیا کر سکتا ہے۔''

صفحہ ۴۲ پر نقل ہونے والے یہ الفاظ کسی بے بس اور مجبور کھلونے کے نہیں ہو سکتے۔ غنڈے دونوں طرف تھے۔ ۳ جولائی ۱۹۷۸ء کے ڈھکوسلے پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ لائن کے اس طرف لٹیروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کی فوج ہے۔ فوجی بغاوت کے بعد سے حکومت کی صفوں میں ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی ہے۔ جب اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر نے اپنے یہ زریں الفاظ ادا کئے تھے۔ تب ضرور ان کے ذہن میں مشین گن بدست سیاستدان، وھیلر ڈیلر وردی پوش وزیر اعلیٰ اور داڑھی کی آڑ میں شکار کھیلنے والے ملاں ہوں گے۔ غم و آلام میں بھی مزاح کے پہلو نکل آیا کرتے ہیں۔ دونوں طرف کے لٹیروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں، نے کتنا بھی

نقصان پہنچایا ہو وہ اس قدر نہ تھا کہ ڈریکولائی فوجی بغاوت کا جواز بنتا۔ نقصان اس قدر معمولی تھا کہ ۶ اپریل ۱۹۷۷ء کو ایک اور پریس کانفرنس میں چیف الیکشن کمشنر نے بڑے اعتماد سے وعدہ کیا کہ وہ "چھ ماہ کے اندر اندر سب گورکھ دھندا سلجھا لیں گے۔" یہ وائٹ پیپر کے صفحہ ۲۵۹ پر ہے۔

اگر میری حکومت نے چیف الیکشن کمشنر کے کام میں انتخابات سے پہلے' دوران یا بعد میں کوئی مداخلت کی ہوتی تو وہ بی بی سی کے نمائندے سے یہ وعدہ نہ کرتے کہ وہ سرکاری مداخلت کے پہلے اشارے پر ہی مستعفی ہو جائیں گے۔

میری حکومت کا تختہ الٹے جانے کے بعد بھی' ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان واپسی پر مسٹر سجاد احمد جان نے ایک اخباری انٹرویو میں سخت الفاظ ضرور استعمال کیئے مگر دھاندلی کا الزام نہیں لگایا۔ ان کی اعصابی حالت کے پیش نظر سخت الفاظ درگذر کیئے جا سکتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے مجھ پر سیاسی مداخلت یا دباؤ کا کوئی الزام نہیں لگایا۔ اگرچہ میں جیل میں قتل کا مقدمہ بھگت رہا تھا اور حکومت مجھ پر الزام تراشی کرنے والے ہر شخص کو فیاضی سے "شاباش" دیتی تھی۔ سابق چیف الیکشن کمشنر کوئی عام شخص نہ تھے۔ اس سے قطع نظر' سجاد احمد جان کی پریس کانفرنس (جس کا وائٹ پیپر کے صفحہ ۳۳۱ اور ضمیمہ نمبر ۱ ۳۲۱ میں ذکر ہے) کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ انھوں نے امیدواروں کو مورد الزام ٹھہرایا تھا اسی اخباری انٹرویو کا متعلقہ حصہ یوں ہے۔

> "علاج کے بعد وطن واپسی پر اے پی پی کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ خامی الیکشن کمیشن کے بنائے ہوئے بنیادی قواعد میں نہیں تھی اور نہ ہی منصفانہ اور دیانتدارانہ انتخابات کرانے کی کوششوں میں کوئی کسر رکھی گئی تھی۔ انتخابی عمل کی ناکامی کا بڑا سبب حکمران جماعت کے امیدواروں کی طرف سے سرکاری مشینری اور اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال تھا۔ وہ انتخابات کے ذمہ دار سرکاری افسروں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو گئے اور یوں بیلٹ بکسوں کے تقدس کو پامال کر دیا۔"

میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ صدر اور وزیراعظم کی حیثیت سے یا اس کے بعد بھی، جبکہ میں جیل میں پھانسی کوٹھری میں ہوں، سابق چیف الیکشن کمشنر نے ذوالفقار علی بھٹو پر

سرکاری مداخلت

سرکاری دباؤ

سرکاری دھاندلی

یا انتظامی دھمکیوں، زبردستی یا ڈرانے دھمکانے کا کوئی الزام نہیں لگایا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سرکاری دھاندلی کی یہ دستاویز تیار کرنے والوں نے ان صاحب سے پوچھ گچھ نہیں کی۔ تمام بیانات یا تبصرے اے۔ زیڈ۔ فاروقی کی 'سنی سنائی' شکل میں سامنے آئے ہیں۔ یقیناً یہ فطری تقاضا تھا کہ چیف الیکشن کمشنر سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ اگر وہ ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان واپسی پر پریس کانفرنس کر سکتے تھے تو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بھی پیش ہو سکتے تھے۔ اگر کمیٹی ۹۰۰ گواہوں سے تفتیش کر سکتی تھی تو سابق چیف الیکشن کمشنر مسٹر سجاد احمد جان کو اگر سب سے پہلا نہیں تو ابتدائی گواہوں میں ضرور ہونا چاہیے تھا۔ وہ ترنم کی ملکہ ترنم تھے، سب سے اہم کردار۔ انھیں نمبر ایک وعدہ معاف ہونا چاہیے تھا۔ شاید ان کا بیان ریکارڈ بھی کیا گیا ہو مگر اگر کیا گیا تھا تو وہ اس ضخیم جلد سے غائب کیوں ہے؟ اور اگر ریکارڈ نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ کیوں نہیں بیان کی گئی؟

یہ بات بھی عجیب ہے کہ الیکشن کمیشن کے سکریٹری کو مارشل لاء کے نفاذ کے ایک ہی روز بعد یعنی ٦ جولائی ۱۹۷۷ء کو دوبارہ ڈیوٹی سنبھال لینے کا اعزاز بخشا گیا، جیسا صفحہ ۳۴ پر ریکارڈ اسی کے اپنے بیان سے ظاہر ہے۔ زیڈ۔ اے۔ فاروقی بڑا تابعدار گواہ رہا ہے۔ اسی نے مجھے اور میری انتظامیہ کو بدنام کرنے کے لئے کوئی جھوٹ اور غیر اخلاقی حرکت رہنے نہیں دی۔ تاہم اس نے سابق چیف الیکشن کمشنر کو ملوث کرنے یا ان پر الزام تراشی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس ان کا دفاع کرنے اور ان کی مجبوریوں اور مشکلات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سابق چیف کا دفاع کرتے ہوئے الیکشن کمیشن کا سکریٹری کہتا ہے کہ "وہ بے چارے، اکثر شدید

دباؤ کا شکار رہتے اور استعفیٰ دینے کی باتیں کرتے۔''

صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱ پر اے۔ زیڈ۔ فاروقی نے سجاد احمد جان کو ایک عظیم محبِ وطن اور صاحبِ کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔

اگرچہ صدارتی حکم نمبر ۴ کے ذریعے ایک روز بعد مسٹر اے۔ زیڈ فاروقی کو بحال کر دیا گیا تھا۔ مگر چیف الیکشن کمشنر مسٹر سجاد احمد جان کو فوری طور پر ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ یہ اطلاع وائٹ پیپر کے صفحہ ۲۸ پر دی گئی ہے۔ فاروقی کی بحالی حکومت کی عمومی پالیسی کے مطابق نظر آتی ہے۔ مگر جس باس کا وہ دفاع اور تعریفیں کرتا ہے' اس کی چھٹی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے؟ کیا سجاد احمد جان فوجی جنتا کا شریکِ کار ہے یا دھاندلی میں شریک سازشی؟ جو بھی ہے ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء جب دھاندلی کے ضمن میں حرفِ آخر' وائٹ پیپر' شائع کیا گیا تو یہ پوزیشن واضح ہو جانی چاہیے تھی۔ اگرچہ یہ دستاویز بنیادی طور پر چیف الیکشن کمشنر کے پرانے بیانات اور پریس کانفرنسوں پر انحصار کرتی ہے۔ لیکن اس میں سیکریٹری الیکشن کمیشن' چیف کی طرف سے اور ان کے نام پر ساری بات کرتا ہے جو شخص سب سے اہم تھا' اس کا اپنا کوئی بیان نہیں۔

ڈارون کی گمشدہ کڑی نہیں ملتی۔ وائٹ پیپر میں سے سجاد احمد جان کی شہادت کی عدم موجودگی مزید پریشان کن ہو جاتی ہے جب ہم تین روز بعد وائٹ پیپر پر ان کے ردعمل کو لاہور میں اے پی پی کے نمائندے کے حوالے سے پڑھتے ہیں۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۸ء کا یہ ڈسپیچ کہتا ہے کہ سابق چیف الیکشن کمشنر اب سوئی گیس کے زہر سے صحت یاب ہو چکے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو وائٹ پیپر تیار کرنے والوں کا فرض تھا کہ وہ اس کلیدی افسر کی شہادت ریکارڈ کرتے۔ اس نامکمل دستاویز کے عین وسط میں یہ عظیم شگاف پُر ہونا چاہیے۔ اگر سابق جج صاحب کی صحت شکار شروع ہوتے وقت خراب تھی تو ان کی شہادت صحت یابی کے بعد ریکارڈ ہو سکتی تھی۔ ان کا بیان اس قدر اہم تھا کہ اس کی خاطر وائٹ پیپر کی اشاعت چند ہفتے ملتوی ہو سکتی تھی تا کہ وہ بیان بطور ضمیمہ شامل ہو سکے۔ قارئین کو اس بنیادی خامی کے پیش نظر نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

حالیہ چیف الیکشن کمشنر

چیف الیکشن کمشنر اور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے عہدے کو مدغم کرنے کے بعد جب موجودہ حکومت چیف الیکشن کمشنر کے عہدے کی آزاد حیثیت کی ڈینگ مارتی ہے تو یہ ایک سنگدلانہ مذاق کے سوا اور کیا ہے۔ اور یہ دونوں عہدے اس شخص کے کنٹرول میں ہیں جو میرے خون کا پیاسا ہے۔ چیف الیکشن کمشنر کا مجھ سے مجنونانہ تعصب اب تو دنیا بھر میں تسلیم کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے۔ اور ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کے عدالتی فیصلے اور ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کے وائٹ پیپر کے ۴۰۵ صفحات کے ایک پیراگراف سے عیاں ہے۔ نفرت کی بنیاد پرانی ہے' ۱۹۶۳ء میں ڈھاکہ سے اس کا آغاز ہوا تھا اور اب یہ عروج پر پہنچ چکی ہے۔

جب میں وزیر خارجہ تھا اور مولوی مشتاق سکریٹری قانون تھے تو ۱۹۶۳ء کے ڈھاکہ کے قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران ایک غلط فہمی نے جنم لیا۔ یہ ایک تکلیف دہ سفر کا آغاز تھا۔ اس دشمنی کے پس منظر میں مولوی مشتاق نے لاہور کے کیمپ جیل میں میری نظر بندی کے خلاف درخواست کی سماعت خفیہ طور پر سننے پر خوشی خوشی سے آمادگی ظاہر کردی۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت نے بعد میں وہ حکم بھی واپس لے لیا۔

صورتِ حال میں تبدیلی کے بعد جب میں پاکستان کا صدر بنا تو وہ اس کے فوراً بعد مجھ سے راولپنڈی کے پنجاب ہاؤس میں ملا۔ اس نے کھلے لفظوں میں اپنے عزائم اور تجاویز کا اظہار کیا اور کہا کہ تاریخ کے اس نازک مرحلے پر نئے صدر کو عدلیہ کا کنٹرول کسی وفادار شخص کے ہاتھ میں دینا چاہیے۔ جب چند ماہ بعد میری حکومت نے محمد اقبال کو چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ مقرر کر دیا گیا تو مولوی مشتاق کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس وقت شاید سینیارٹی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ تب یہ یقیناً اس کے مفاد میں نہیں تھا تاہم بعد میں اس پر خاصا زور دیا جاتا رہا۔ اسے اپنے غصے پر قابو نہیں تھا اور اس نے بار ہا اپنی نفرت کا اظہار سرکاری و غیر سرکاری دونوں حیثیتوں سے کیا۔ بوکھلاہٹ کی انتہا یہ کہ اس نے پنجاب کے سابق گورنر اور وزیر اعلیٰ کو یہ مشورے دینے شروع کر دیئے تھے کہ وہ میری ''کھوپڑی سے گولی پار'' کروادیں۔ جب آئینی ترامیم کے مطابق جسٹس اسلم ریاض حسین کو

لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا تو مولوی صاحب نے اس کو ناقابل برداشت توہین سمجھا۔ اس حد تک کہ مقدمے کے پہلے روز ہی اس نے اپنے دل میں چھپے بغض کا اظہار اپنی سُپر سیشن کے کیس کو ایک مفروضہ مثال کے طور پر پیش کیا۔

۱۹۷۵ء کے موسم خزاں کے آغاز میں ان کا سینئر وفاقی وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ سے تلخ اور ناگوار تبادلۂ خیالات ہوا۔ دوسری سپر سیشن کے بعد سے انھوں نے اپنے سرکاری فرائض کی طرف توجہ دینا چھوڑ دی تھی اور زیادہ وقت اپنے چیمبر ہی میں گذارتے تھے۔ ذرا سا جواز ملنے پر وہ یورپ پرواز کر جاتے تھے۔ تاکہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے وقت وہ یورپ میں تھے۔ اور بغاوت کے سرغنوں نے انھیں واپس بلا لیا تھا اور اندرونی حلقے میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت نامے پر وہ کسی جنونی کی طرح پھولے نہ سماتے تھے۔

ان شاندار خدمات کے عوض، جو ابھی انھیں سرانجام دینا تھیں، ان کو فوراً لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس کا عہدہ پیش کیا گیا۔ میرے مقدمہ قتل کی سماعت کے دوران اسے مستقل کر دیا گیا۔ اپنی تقرری پر مہر تصدیق اس نے پاکستان پیپلز پارٹی اور میری حکومت پر ایک ریڈیو اور ٹی وی انٹرویو کے دوران شدید حملوں سے ثبت کی۔

۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو میرے کیس سے نمٹنے والے جسٹس صمدانی اور جسٹس مظہرالحق کے ڈویژنل بنچ کی چھٹی کرا کے مقدمہ قتل کی خود سماعت کرنے کے زمانے سے لے کر ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو فیصلے کے اعلان تک لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا رویہ اور سلوک ایک وحشت ناک داستان رہی ہے۔ مجھے پھانسی پر لٹکانے کے حکم سے شاید ان کی تسلی نہ ہوئی تھی اسی لئے مجھے پھانسی کوٹھری میں فوراً منتقل کرنے کی طرف انھوں نے ذاتی توجہ دی۔

اور اب مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بارے میں وائٹ پیپر کی اشاعت سے رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی ہے۔ یہ دستاویز اس وقت شائع کی گئی ہے، جب میرے وکلاء عدالت میں میرے دفاع کے لئے آخری کوششیں کر رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وکلاء استغاثہ حکومت کے مؤقف کی ترجمانی کریں، میرے خلاف اس دستاویز کے ذریعے سرکار نے پہلے ہی اپنے موقف کا اعلان کر دیا ہے۔ چیف الیکشن کمشنر اور چیف جسٹس کے طور پر مولوی مشتاق نے خبث باطن کی انتہا کر دی ہے۔

۱۱......

گھناؤنی سازش

پارٹی فنڈز اور بیرونی امداد

بیرونی طاقتوں کی طرف سے پی این اے کی حمایت کوئی عاشقی کا چکر نہ تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ معاملہ طے کیا گیا تھا۔

معاہدہ یہ تھا کہ پی این اے کی اقتصادی اور سیاسی امداد کی جائے گی تاکہ ایک مصنوعی ایجی ٹیشن کے ذریعے میری حکومت کا تختہ الٹا جا سکے۔ موقع ملتے ہی فوج اقتدار پر قبضہ کر لے گی۔ زمین ہموار کی جائے گی اور رکاوٹیں دور کی جائیں گی۔ مستحکم ہونے کے بعد میری حکومت کا تختہ الٹنے کے مقاصد پورے کر لئے جائیں گے۔ ان شرائط اور تفصیلات کو فروری ۱۹۷۷ء میں حتمی شکل دی گئی۔ چنانچہ اب اگر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے مسئلے پر امریکی امداد بند کئے جانے کے خلاف احتجاج کو دبا دیا گیا ہے تو یہ کوئی نئی یا غیر متوقع بات نہیں ہے۔ یہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی فوجی بغاوت کا لازمی حصہ تھا۔ پی این اے کو معاہدے کے مطابق اپنا کردار ادا کرنا ہی ہے۔ یہ سفارتی ناچ، شدید قسم کے بیانات اور پٹھو پریس کے اداریئے عوام کو بے وقوف بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔

پی این اے کا خیال ہے کہ وہ ایک دفعہ عوام کو بنا چکی ہے تو دوسری دفعہ بھی بنا سکتی ہے۔ اس وقت جو گرما گرمی ہے، وہ محض شیڈو باکسنگ ہے۔ اسے ڈریس ریہرسل کا نام بھی دیا جا سکتا

ہے۔ اگر انھیں امریکی فیصلے سے واقعی تکلیف پہنچی تھی تو وہ کوئی مثبت جوابی کارروائی کرتے۔ ایسے کسی چیلنج کا مقابلہ کرنے اور عوام کو ابھارنے کے لئے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پی این اے اور اس کے آقا اس بارے میں قطعاً سنجیدہ نہیں۔ وہ معمول کی لفاظی میں مصروف ہیں۔ عوام ٹھوس اقدامات کی توقع رکھتے ہیں۔ مگر اس کی بجائے محض الفاظ کی شعبدہ بازی دکھائی جاتی ہے۔ امریکہ پر اپنی عالمی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لئے الزام کیوں دہرا جائے؟ اصل ذمہ دار تو ہمارے اندر موجود ہیں جنھوں نے محض اپنی طمع اور بھوک کی خاطر قوم کے بنیادی مفادات کا سودا کر لیا ہے۔ اگر پی این اے کو پاکستان کے عوام کے مفادات اور بہبود کا کوئی خیال ہوتا تو وہ انتخابات کے دوران ۲۵۰ کروڑ اور بعد میں ۵ کروڑ روپیہ لے کر میری حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے بنیادی قومی مفادات کا سودا نہ کرتی۔ دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ معاہدے کی شرائط پوری کرنے کے بعد اس نے پی این اے کو اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے کافی وقت دیا ہے۔ اس کی نظروں میں یہ غیض و غضب اپنے عوام کو دھوکا دینے کی چال کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس ہلے گلے کو عارضی طور پر برداشت کر جائے گا۔ مگر پالیسی میں کسی بنیادی تبدیلی کو اس معاہدے کی خلاف ورزی سمجھے گا، جو فروری ۱۹۷۷ء میں پی این اے اور چیف آف آرمی اسٹاف کے ساتھ طے پایا تھا، اور جس کی قیمت ادا کی گئی تھی۔

یہ دوطرفہ معاہدہ شروع دن سے ہی ایک طے شدہ ڈگر پر چل رہا ہے۔ حکومت میں رسمی طور پر شامل ہونے کے سوال پر پی این اے کے طویل مذاکرات اسی منصوبے کا حصہ تھے۔ مضحکہ خیز پانچ نکات پر اس کا اصرار پی این اے کی 'آزادی' ثابت کرنے کے لئے ایک ڈرامہ تھا۔ ہر چیز طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہی ہے۔ تاہم یہ درست ہے کہ اصل سازش میں تمام پارٹیوں اور لیڈروں کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ہر بات، ہر کسی کو تو نہیں بتائی جا سکتی۔ اس سطح کی سازشوں میں تو دائیں ہاتھ کو بائیں کا پتہ نہیں ہوتا۔ پورا منصوبہ، جو ایک انتہائی خفیہ راز تھا، صرف چند منتخب افراد کے علم میں تھا۔ اگرچہ عمومی مقاصد پر اکثر و بیشتر کا اتفاق تھا مگر محض بات چیت کی حد تک، مشترک مفادات اور اتفاقِ رائے کی سطح تک۔ لیکن اصل سازش کے معاملے میں صرف ایک

پارٹی اور اس پارٹی کے ایک سیاستدان کو ہی پوری طرح اعتماد میں لیا گیا تھا۔

خاکساروں کو نظر انداز کیا گیا۔ انھیں بس نظام مصطفےٰ کے نعرے کی تال پر نچا کر مقصد پورا کیا گیا۔ اسی طرح این ڈی پی کو بھی اصل منصوبے سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ رابطے اور ترسیل کا واحد ذریعہ جماعتِ اسلامی تھی اور میاں طفیل محمد اس کا گماشتہ تھا۔ دوسروں کو پلاٹ کی کم تر اور مختلف پہلوؤں کی معلومات تھیں، جس کی سطحیں ایک سے دوسرے شخص یا پارٹی تک بدلتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پیشہ ور ''اشتعال انگیز'' ایجنٹ میاں طفیل محمد پاکستان کی امداد بند کرنے کے امریکی فیصلے پر زبانی جمع خرچ کر رہا ہے۔ تاکہ ''سادہ لوح عوام'' کو کنفیوز کیا جا سکے۔ مگر عوام یہ بھولے نہیں کہ یہ پی این اے ہی تھی جس نے پولنگ کے روز کراچی، حیدرآباد، ملتان اور دوسرے بڑے شہروں میں تشدد کو ہوا دی تھی۔ ہر کسی کو یاد ہے، کس طرح پی این اے کے تنخواہ داروں اور غنڈوں نے سنٹروں پر حملے کئے اور آگ لگائی۔ پی این اے کے لیڈروں کی انتخابی نتائج کے اعلان سے پہلے ہی حکومت پر قبضہ کر لینے کی دھمکیاں ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔

غیر ملکی مداخلت کا چوتھا حوالہ صفحہ ۳۸۳ پر ہے:

> ''غیر ملکی فنڈز کی پاکستان میں یلغار کا الزام، جو پہلے زیر بحث آ چکا ہے، بے بنیاد دکھائی دیتا ہے۔ کسی بھی قسم کی غیر ملکی مداخلت کی کوئی بھی شہادت نہیں مل سکی۔''

آخر فوجی ٹولہ پی این اے کے داغ دھونے کے لئے اس قدر بیقرار کیوں ہے؟ میں نے جرنیلوں پر تو غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے کا الزام نہیں لگایا تھا؟ الزام میں نے پی این اے پر لگایا تھا اور صفائی حکومت پیش کر رہی ہے۔ پی این اے کی معصومیت کو اس طرح ثابت کیا جاتا ہے جیسے اپنی معصومیت ثابت کی جا رہی ہو۔ یوں لگتا ہے کہ فوجی ٹولے کو خدشہ ہے کہ اس کے داغ تبھی دھلیں گے، جب پی این اے کے داغ دھل جائیں۔ اسی لئے انھیں ''پی این اے پر بیرونی امداد حاصل کرنے کے الزام میں کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔ اور نہ کسی اور قسم کی مداخلت کی شہادت ملتی ہے۔'' تاہم میں پھر یہ دہراتا ہوں کہ تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود میں اس دور کی تفصیلات

میں نہیں جاؤں گا۔ ظاہر ہے یہ کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں بیٹھ کر اس سنسنی خیز ریکارڈ میں کوئی چونکا دینے والا اضافہ کر سکوں۔

جب اگست ۱۹۷۷ء میں میں راولپنڈی آیا تو میں نے عزیز احمد سے دفتر خارجہ کی بیرونی مداخلت کے موضوع پر تیار کردہ پچاس صفحات پر مشتمل دستاویز کی نقل مانگی تھی۔ اس نے کہا کہ اس دستاویز کی جو کاپی اس کے پاس تھی، وہ اس نے سکریٹری جنرل ان چیف غلام اسحٰق کو دے دی تھی۔ وائٹ پیپر میں اسی لئے بیرونی مداخلت کی شہادت نہ ملنے پر نا قابلِ فہم اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ باقی واقعات چھوڑ بھی دیں، تو صرف ''آپریشن پہیہ جام'' ہی بیرونی مداخلت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے وقت غیر ملکی رہنمائی میں آپریشن پہیہ جام پر عمل کیا گیا تھا۔ یہ فوج کا ٹاپ سیکرٹ تھا۔ چراٹ میں اس کے لئے ٹریننگ دی گئی تھی۔ آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کا پہیہ جام کر دیا جائے۔ اور جب کراچی میں بھی پہیہ جام ہوا اور میں نے چیف آف آرمی اسٹاف کو بتایا کہ مجھے فوج کے گزشتہ آپریشن پہیہ جام کے بارے میں معلوم ہے، تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے کہا کہ اسی کوڈ کا استعمال ایک ناخوشگوار اتفاق ہے۔ چیف آف آرمی اسٹاف کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس لئے ہکلاتے ہوئے پی این اے میں شامل چند ریٹائرڈ فوجی افسروں کا حوالہ دیتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔

اگرچہ میری ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کی تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے کہ ''میں نے واویلا نہیں کیا''، مگر اس کے باوجود وائٹ پیپر میں بیرونی مداخلت کی حرف بہ حرف روداد بیان نہ کرنے پر طعنہ زنی کی گئی ہے۔ تاہم جائز حدود کے اندر رہ کر میں نے ساری بات کہہ دی ہے۔ میں سرکاری دستاویزات کو تاش کے پتے یا ان سے بھی بدتر نہیں سمجھتا۔ مجھ پر احتیاط اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا لازم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ واقعات کے بہاؤ اور پی این اے اور فوجی ٹولے کے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے سارا بھانڈا پھوٹ رہا ہے۔ جیسے پی این اے کے سارے سیاست دانوں کو پوری کہانی نہیں بتائی گئی تھی، اسی طرح سارے جرنیلوں کو بھی سازش کی تفصیلات اور گہرائی کے بارے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ اس ایک طویل سال کے دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ہر منفی

شہادت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ فنڈ زصرف ایک سیاست دان کو پہنچائے گئے تھے اور وہ جماعتِ اسلامی کا میاں طفیل محمد تھا۔ اب اس نے اس خزانے کو کیسے لٹایا اور کس کس کو لٹایا' یہ اس کے اور پی این کے دوسرے گروہوں کی آپس کی بات ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میاں طفیل محمد نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مشورہ دیا تھا کہ تمام نامناسب شہادتوں کو تلف کر دیا جائے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو مجھے مری میں اطلاع ملی کہ ۱۹ جولائی کو اس موضوع سے متعلق دستاویزات کا انبار جلا دیا گیا ہے۔ اور میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وائٹ پیپر کی اشاعت تک کے ۳۸۵ دنوں میں ایسی کئی آتشبازیاں ہوئی ہوں گی۔ اس تسلی کے بعد کہ اس موضوع سے متعلق ہر ثبوت کو تلف کیا جا چکا ہے' وائٹ پیپر میں مجھے چیلنج کیا جاتا ہے کہ میں اپنی پھانسی کوٹھری سے میاں طفیل محمد کو اس گھناؤنے منصوبے میں شرکت کی حرف بہ حرف روداد پیش کروں۔

میں پھر کہوں گا کہ یہ سب ڈرامہ ہو رہا ہے۔ جو ہونا تھا' ہو چکا ہے اور سب ایک منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔ فریقِ ثانی نے مقاصد پورے کرنے کے لئے ایک سال کی مہلت دی تھی اور اب وہ پہلو بچا رہا ہے۔ یہ لوگ لنگڑے لولے بہانے کر کے مہلت میں توسیع کی اپیل کر رہے ہیں۔ مگر صورت یہ ہے کہ چابک اور کوڑے کی ننگی آمریت بھی عوام کو خوفزدہ اور زیر نہیں کر سکی۔ ان کا خیال ہے کہ پی این اے کے ساتھ کھلم کھلا اشتراک شاید اس موجودہ تبدیلی کا موقع فراہم کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ریاستوں کے مفادات کا تحفظ خالی خولی بیان بازی سے تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے لئے لفاظی کی نہیں قربانیوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور قربانیاں عوام تبھی دیا کرتے ہیں' جب انھیں ابھارا جائے۔ مگر انھیں کوئی غیر نمائندہ ٹولہ ابھار نہیں سکتا۔ وہ صرف ان لیڈروں کے پیچھے چلتے ہیں' جن پر وہ بھروسہ کرتے ہوں۔ باقی سب ڈھکوسلا ہے۔ عہدِ قدیم سے بین الریاستی ڈپلومیسی کا اصول رہا ہے کہ دباؤ کا جواب دباؤ ہے۔ عوام کے جوابی دباؤ کے بغیر یہ جنگ ہاری ہوئی ہے اور عوام کو کوڑے مار مار کر انھیں ایسے سورمائی کارنامے انجام دینے کے قابل ہی کب چھوڑا گیا ہے۔ اب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پی این اے کے لیڈروں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے کہ امداد بند ہونے سے خود انحصاری بڑھے گی اور یہ تو ایک نعمتِ غیر مترقبہ

ہے۔ منافقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مسئلہ اقتصادی امداد کا نہیں' ری پراسیسنگ پلانٹ کا ہے۔ اگر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کو ترک کیا گیا یا اس میں ترمیم کی گئی (جو کہ بظاہر ہو چکا ہے) تو اس کے جو نتائج ہوں گے' ان کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

قوم کو بعض تاریخ ساز فیصلوں کے لئے تیار رہنا چاہیے چیف آف آرمی اسٹاف پہلے ہی عوام سے کئے کئی مقدس وعدے توڑ چکا ہے اب وقت ہے کہ ایک وعدہ وہ کسی غیر ملکی طاقت سے بھی توڑے اور اپنے لئے نہیں بلکہ پاکستان کی خاطر اپنے وعدے سے مکر جائے۔ مغرب کی نماز سے پہلے یا بعد میں اسے ٹیلی ویژن کے ذریعے بیرونی دباؤ کے مسئلے پر قوم کو اعتماد میں لینا چاہیے' قومی اتحاد کی اپیل کرنا چاہیے اور بیرونی دباؤ کی مزاحمت کی علامت اور پہلے قدم کے طور پر سینٹو سے الگ ہونے کا اعلان کرنا چاہیے۔ مگر یہ سب بغیر گھٹیا اداکاری کے کرنا چاہیے۔ اب عوام ڈراموں سے تنگ آ چکے ہیں۔

ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے بنیادی سوال اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے قطع نظر گذشتہ ایک برس میں پاکستان نے مکمل محتاجی کی سمت میں ہی سفر کیا ہے۔ ملک کو ایک ایسی جگہ لے آیا گیا ہے کہ اسے دو ملین ٹن گندم درآمد کرنا پڑی ہے۔ خود کفالت کا کیا خوبصورت راستہ ہے۔ یہ گندم کا بہترین موسم ہے اور آٹے کی قیمتیں ۸۰ روپے فی من سے بھی زائد۔ مسلح افواج کے لئے (چینی امداد کے علاوہ) خرچ کئے جانے والے قریباً ایک بلین کو چھوڑ کر برآمدات سے حاصل ہونے والے غیر ملکی زرمبادلہ کا نوے فیصد گندم' خوردنی تیل اور پٹرول کی درآمد پر خرچ کیا جائے گا۔ ان تین آئٹموں پر ہونے والا خرچہ ہی ۱۱۳۰ ملین ڈالر بنتا ہے۔ اور اس میں قرضوں کا سود اور دوسری اہم درآمدات شامل نہیں' جو ۲ء۵ بلین ڈالر تک پہنچ جاتا ہے۔ محتاط اندازوں کے مطابق بھی سالِ رواں میں درآمدات کا خسارہ ۳ء۵ بلین ڈالر سے کم نہیں ہوگا۔ اور تجارت میں یہ خسارہ کم از کم ۲ء۱ بلین ہوگا' وہ بھی اس صورت میں اگر حالیہ بارشوں سے کپاس کی موجودہ فصل برباد نہیں ہوئی۔ یہ انتہائی شرمناک صورتحال ہے۔ اب حکومت کو ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک کاسۂ گدائی لئے دستک دینا ہوگی۔ اور غیر ملکی سربراہِ مملکت صاحب کی خدمت میں

حاضری دینا پڑے گی اور وہ کہے گا۔ ''برائے مہربانی آپ اپنا پہلا وعدہ پورا کریں اور اپنی پینٹ میرے حوالے کردیں...... میرا مطلب ہے پلانٹ۔''

---

۲۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ایک ضمنی بیان میں افضل سعید کی طرف سے یہ دعویٰ منسوب کیا گیا ہے کہ:

''آغا حسن عابدی مسٹر بھٹو کے لئے بڑی رقوم کیش میں لایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ فلاں سربراہِ مملکت نے بھیجی ہیں۔ تاکہ وزیراعظم انھیں انتخابات کے لئے استعمال کرسکیں۔ یہ رقوم وزیراعظم تک میں ہی پہنچایا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً دو سال جاری رہا اور ہر مرتبہ رقم لاکھوں میں ہوا کرتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ عطیات انتخابات کے لئے ہیں۔''

افضل سعید کے بیان پر غور کرنے سے پہلے ذرا متعلقہ افراد کا جائزہ تو لے لیں۔ آغا حسن عابدی نے ان الزامات کی تردید کی ہے اور یہ سب کو علم ہے کہ جب میری حکومت نے بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومیایا تو آغا حسن عابدی کا ممتاز اور ترقی پذیر نجی بینک' یونائیٹڈ بینک بھی ان میں شامل تھا۔ یہی نہیں میری حکومت نے آغا حسن عابدی کا پاسپورٹ بھی ضبط کرلیا تھا اور اسے اپنے بینک کے معاملات کی تحقیقات مکمل ہونے اور الزامات سے بری ہونے سے پہلے پاکستان چھوڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کیا بینکاروں سے دوستیاں ایسے بنائی جاتی ہیں؟

غیر ملکی سربراہِ مملکت کا نام نہیں لیا گیا۔ اگر ان کا نام لیا گیا ہوتا اور اگر میں نے کسی دوست سربراہِ مملکت سے فنڈز حاصل کئے ہوتے تو میں بلا جھجک اس کا اعتراف کرلیتا۔

مسٹر حسن عابدی کا تعلق اگر کسی ایک ملک یا ایک سربراہِ مملکت سے ہوتا تو بات پھر بھی قرینِ قیاس تھی مگر ان کا تو ایک وسیع کاروبار ہے جو کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً ابوظہبی' دوبئی اور متحدہ عرب امارات کی دوسری ریاستیں' کویت' ایران' سعودی عرب اور ان سب کے سربراہوں سے میرے بڑے اچھے تعلقات رہے ہیں۔ آخر افضل سعید کے بیان کے ذریعے کس کو ملوث کیا

جارہا ہے؟ اور وہ بھی محض میاں طفیل محمد کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے۔ یہ ہے اس حکومت کی ذہنیت۔ اس کے خیال میں میاں طفیل محمد کے جرم کی پردہ پوشی کا طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی ایسے ہی الزام میں ملوث کر دیا جائے۔ مگر طفیل ایک مجرم ہے۔ اس نے ملک کے خلاف سازش کی ہے۔ میں معصوم ہوں، میں نے اپنے وطن کے اعلیٰ ترین مفادات کے تحفظ کی جدوجہد کی ہے۔ اگر میں نے کسی سربراہِ مملکت سے رقم لی بھی ہوتی تو اس کا طفیل محمد کے جرم سے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ مگر میرے تو ایسی کسی رقم وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر میری دشمنی میں حکومت کسی دوست ملک سے تعلقات کی قربانی دینا چاہتی ہے۔ شہنشاہ ایران، شاہ خالد، صدر قذافی یا شیخ زید میں سے کس کے ملک کو اپنے سابق صدر اور وزیر اعظم کی کردار کشی کے نیک مقصد کے لئے ملوث کرنے کا ارادہ ہے؟ عابدی کے بینکنگ کے مفادات مغربی یورپ اور امریکہ میں بھی ہیں۔ وہ بینک آف کامرس اینڈ کریڈٹ انٹرنیشنل (BCCI) کا سربراہ ہے، جو لکسمبرگ میں رجسٹرڈ ہے اور جس کے سابق امریکی بجٹ ڈائرکٹر برٹ لانس کے بینک سے قریبی تعلقات ہیں۔ برٹ لانس جارجیا سے ہیں اور صدر کارٹر کے دوست۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اور میاں طفیل عابدی کے ذریعے ایک ہی سربراہِ مملکت سے پیسے وصول کرتے رہے ہیں۔ آخر کو میرا اسکریٹری افضل سعید مودودی کا رشتے دار تھا۔ وزیراعظم ہاؤس اور اچھرے میں بنا بنایا رشتہ۔

افضل سعید کی دیانت اور کردار کے بارے میں خود وائٹ پیپر مذمت کرتا ہے اور قارئین کو خبردار کرتا ہے۔ افضل سعید، جسے وائٹ پیپر ''کمزور اور جھوٹا'' قرار دیتا ہے، اسے ایک غیر ملکی سربراہِ مملکت سے فنڈز کی مبینہ وصولی کے اہم موضوع پر واحد گواہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ گو وہ مودودی کا قریبی رشتے دار ہے، پھر بھی میں اسے الزام نہیں دوں گا، کیونکہ مجھے علم ہے کہ یہ ضمنی بیان اس سے دباؤ کے تحت لیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر یہ رقم مجھے دو سال میں ادا کی گئی تھی تو انتخابات کے دوران روپے کی قیمت میں اضافے اور غیر ملکی مارکیٹوں سے اس کے غائب ہونے کے الزامات کا اطلاق پی این اے کو فروری اور مئی ۱۹۷۷ء کے دوران ملنے والے ۳۰ کروڑ روپے پر ہی ہوسکتا

ہے۔ دو سال کے عرصے میں قسط وار ادا ہونے والے دو تین کروڑ روپے سے تو روپے کی قیمت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ اور نہ ہی غیر ملکی مارکیٹوں سے روپیہ غائب ہونے کے لئے یہ کافی ہے۔ ایسا تبھی ممکن تھا جب ایک مختصر عرصے میں اچانک غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آ جائے۔

بدعنوانی کے بعد پارٹی فنڈز کا ذکر آنا لازمی ہے۔ اس کے تذکرے میں مجھ پر اور میری پارٹی پر الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک غیر ملکی سربراہِ مملکت کو بھی غلط طور پر ملوث کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا۔ ضمیموں میں ہمارے اکاؤنٹس کی بینک دستاویزات بھی شامل کی گئی ہیں۔ ہمیں بدنام کرنے اور بہتان تراشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ ظاہر ہے انتخابات کے لئے پارٹی فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپے کی انتخابات کے لئے وہی حیثیت ہے۔ جو پٹرول کی موٹر کار کے لئے۔ (مہاتما) گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کو برلا' ڈالمیا اور ٹاٹا جیسے بھارتی سرمایہ داروں نے ہر قسم کی اقتصادی امداد دی تھی۔ جب آزادی کی منزل قریب آ گئی تو مہاراجاؤں نے کانگریس کے صندوقوں کو بھر ڈالا۔ مسلم لیگ کی گاڑی کو بھی اصفہانیوں' راجہ صاحب آف محمود آباد اور دوسروں کا پٹرول ملتا تھا۔ جب تقسیم کے دن قریب آئے تو نواب آف جونا گڑھ اور نواب بھوپال جیسوں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں ایوب خان نے فنڈز کے لئے سرمایہ داروں کو نچوڑا۔ بلکہ اس نے تو غیر ملکی تیل کمپنیوں سمیت پاکستان میں کام کرنے والی غیر ملکی فرموں تک سے خاصی معقول اقتصادی امداد حاصل کی تھی۔

معتبر ذرائع کے مطابق حال ہی میں حکومت نے اصلی مسلم لیگ کے فنڈز موجودہ نام نہاد مسلم لیگ کے حوالے کر دیئے ہیں۔ ان کی مالیت ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے تحت ضبط ہوتے وقت دو کروڑ (دو ملین) تھی۔ اب مجموعی سود در سود کے بعد یقیناً یہ رقم بہت زیادہ ہو چکی ہو گی۔ اور یہ بھاری رقم حالیہ بارشوں میں گجرات کی کسی بدنما لال کوٹھی کی چھت گرنے سے تو نہیں ٹپکی۔ واحد قابلِ ذکر سیاسی جماعت جسے اپنی تنظیم یا انتخابات کے لئے فنڈز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جماعتِ

اسلامی ہے۔ یہ جماعت قربانی کی کھالوں سے چلتی ہے' اسے روپے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انتخابات کے دوران مودودی نے جو غیر ملکی چیک وصول کیا تھا اور جس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اخباروں میں چھپی تھی' تو حلوے کی تقسیم کے لئے تھا۔ وائٹ پیپر نے یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ جبکہ ہم جہازوں میں اڑ رہے تھے' پی این اے گدھا گاڑیوں میں سفر کرتی تھی۔ جبکہ پی پی پی ٹرینوں اور بسوں کو استعمال کرتی تھی یو پی این اے بیل گاڑیوں پر یا پیدل ہی پیر پٹخ رہی تھی۔ جب کہ پیپلز پارٹی کو فنڈز کی ضرورت تھی' پی این اے کی مہم خود بخود چل رہی تھی۔ ہم نے فنڈز استعمال تو کئے تھے' مگر غیر ملکی فنڈز نہیں۔ پی این اے نے بھی فنڈز استعمال کئے مگر وہ غیر ملکی فنڈز تھے۔ حال ہی میں پی این اے کے سیاست دانوں نے ایک دوسرے پر فنڈز کی رقوم خورد برد کرنے کے الزام عائد کئے ہیں۔ مسلم لیگ کے ایک رکن نے الزام لگایا ہے کہ پی این اے کی تحریک کے دوران اصغر خان کو لاکھوں روپے دیئے گئے تھے' جن کا انھوں نے جھنجھلائی ہوئی پی این اے کو کوئی حساب نہیں دیا۔

یہ کہا گیا ہے کہ میری حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے چلائی جانے والی پی این اے کی تحریک برصغیر کی تاریخ کی سرمائے کے لحاظ سے بہترین تحریک تھی۔ سرگرم کارکنوں اور جلوسوں میں شامل ہونے والوں کو باقاعدہ دہاڑی تفریحی الاؤنس اور آمدورفت کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ تصادم میں زخمی یا ہلاک ہونے والوں کے لئے معقول معاوضہ مقرر تھا۔ ہم نے مستحق اور غریب ورکروں کو جو موٹر سائیکل یا بائیسکل دیئے تھے' وہ پارٹی فنڈز سے دیے تھے۔ یہ موٹر سائیکل اور بائیسکل اب غیر قانونی طور پر قبضے میں لے لئے گئے ہیں کیونکہ موجودہ رجعت پسند ڈھانچہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ عام آدمی' غریب اور پسا ہوا کوئی کارکن اپنی پارٹی سے اتنی بھی سہولت حاصل کر سکے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے' وائٹ پیپر میں پی این اے کے فنڈز کے بارے میں چار اہم حوالے موجود ہیں۔ صفحہ ۲۳۷' ۲۳۸ اور ۲۳۹ پر ان کا ذکر ہے۔ میں اس کا پورا اقتباس نقل کرتا ہوں۔

> ''پی این اے نے الیکشن کیسے لڑا اور اس کے لئے مطلوبہ فنڈز کیسے جمع کئے۔ یہ اس وائٹ پیپر کا موضوع نہیں ہے کیونکہ یہ دستاویز عام

انتخابات کے انعقاد کے موضوع تک محدود ہے اور یہ ذمہ داری حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن کی تھی۔ البتہ مسٹر بھٹو نے پی این اے کے فنڈز کے ذرائع کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کو ریکارڈ پر لایا جائے۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۷ کو قومی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''کیا یہ کوئی راز ہے کہ گذشتہ چند ماہ سے پاکستان میں غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ اس قدر کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کراچی میں ڈالر کا ریٹ سات بلکہ چھ روپے تک گر گیا ہے۔ یہ رقم لوگوں کو مختلف خدمات کے معاوضے کے لئے استعمال کی جا رہی ہے۔ جیل جانے کے لئے' اذانیں دینے کے لئے۔ ڈاکیوں' گوالوں اور میٹر ریڈروں کو پیپلز پارٹی دشمن لٹریچر کی تقسیم کے لئے ...... ڈالروں کی بوریوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں۔ میری پارٹی کے ارکان یہ سب باتیں میرے نوٹس میں لاتے رہے ہیں۔ مگر میں نے اس پر واویلا نہیں کیا......''

ڈالروں کی یلغار کا ایک اور حوالہ اس وقت کے وزیر اطلاعات طاہر محمد خان کی ذرائع ابلاغ کے سربراہوں سے روزانہ ملاقاتوں کی روداد میں ملتا ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۷ء کی روداد میں پیپلز پارٹی کو ایک ہدایت نامہ کا حوالہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کوئٹہ اور پشاور میں ڈالروں کے سستے ریٹ کی خبر کو پھیلایا جائے۔ غالباً اس کا مقصد مسٹر بھٹو کی الزام تراشی کے لئے راہ ہموار کرنا تھا۔ انھوں نے الزام تو لگایا مگر کراچی کی مارکیٹ کا حوالہ دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ تاہم ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو نومنتخب قومی اسمبلی کی حلف برداری کی تقریر میں مسٹر بھٹو کا رویہ ذرا مختلف تھا۔ اس تقریر میں میں انھوں نے کہا:

''اگر ضرورت پیش آئی اور مجھے مزید اشتعال دلایا گیا تو میں

حرف بہ حرف یہ روداد بیان کردوں گا کہ کس طرح اپنی خفیہ میٹنگوں میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ وسائل، رقوم اور طاقت کا منبع سمندر پار ہے۔ کیا اپوزیشن والوں کا یہ غیر ذمہ دارانہ دعویٰ مناسب تھا کہ فتح ان کی ہے کیونکہ ان کے وسائل سرحد پار سے آ رہے ہیں......'' میں اس سلسلے میں اپوزیشن کے وعدوں پر یقین نہیں کروں گا کیونکہ یہ ناپختہ، غیر ذمہ دارانہ اور بچگانہ ہیں اور جیسا آپ جانتے ہیں ہمارے دنیا کے تمام ملکوں سے نہایت اچھے تعلقات ہیں۔''

''پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے تقریروں میں بار بار یہ الزام دہرایا گیا کہ پی این اے کو غیر ملکی امداد مل رہی ہے۔ یہ بھی اشارہ کیا گیا کہ خلیج کی مارکیٹ سے پاکستانی کرنسی غائب ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو شاید اس کا پی این اے کی حرکتوں کے ساتھ ساتھ آغا حسن عابدی کے دوروں سے بھی تعلق ہو، جن کے بیگ نوٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔'

جہاں تک مسٹر بھٹو کا تعلق ہے، انھوں نے پی این اے پر الزام ثابت کرنے کے لئے حرف بہ حرف روداد کبھی بیان نہ کی۔ اقتدار کے دنوں میں یا اس کے بعد انھوں نے کوئی دوسری شہادت پیش نہیں کی۔ اگرچہ ان کے وکیل سپریم کورٹ کے سامنے اصل خطوط پیش کر رہے ہیں، پی این اے کی مبینہ غیر ملکی امداد کے بارے میں کوئی دستاویز پیش نہیں کی گئی۔ وزیراعظم کے سکریٹریٹ سے ملنے والے کاغذات میں بھی پی این اے کی خفیہ امداد کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں ملا۔ راؤ رشید نے سابق وزیراعظم کو ۱۲ اپریل کو ایک رپورٹ بھیجی تھی جس میں لکھا تھا:

''لاہور میں پی این اے کو بھاری رقوم فراہم کرنے والوں میں منو شاہزادہ، نسیم سہگل فضل دین اینڈ سنز، شیخ سالم علی شامل ہیں۔''

یہ سب پی این اے کی شرمناک اور کھلم کھلا پردہ پوشی ہی تو ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر حکومت پی این اے کا اس جوش وخروش سے دفاع کیوں کر رہی ہے۔ جیسے دونوں یک جان دو قالب ہوں۔ جولائی ۱۹۷۷ء کی افتتاحی تقریر کے بعد سے سکھر بیراج کے نیچے سے بہت پانی گذر چکا ہے۔ اور آپریشن فیئر پلے' کے بارے میں میں سوال کرنا بے معنی ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فروری ۱۹۷۷ء سے پی این اے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس سازش میں شریک رہے ہیں۔ ایجی ٹیشن ایک ملی بھگت تھی۔ شہری لباس یا ملاؤں کا روپ دھارے فوجی جوان پی این اے کے مظاہروں میں بھیجے جاتے تھے تا کہ ہجوم بڑے اور عوام کو ابھارا جا سکے۔

اس دوران لاہور میں چوتھی کور کے تین بریگیڈیئروں کی عظیم الشان حکم عدولی بھی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تھی۔ اس حکم عدولی کے موقع پر بھی بریگیڈیئروں کا کورٹ مارشل نہیں کیا گیا۔ انھیں ملازمت سے برطرف تک نہیں کیا گیا۔ بس راولپنڈی ٹرانسفر کر دیا گیا اور شاباش دیتے ہوئے ہدایت کر دی گئی کہ ذرا ادھر ادھر ہو جائیں۔ اور اب تک یقیناً انھیں ترقیاں دے کر یا دوسرے طریقوں سے نوازا جا چکا ہوگا۔ جونیئر افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ وزیر خارجہ عزیز احمد پر کراچی کے خطاب کے دوران سوالات کی بوچھاڑ کر دیں۔ جنرل اقبال کے استعفٰی کی کہانی بھی ایک فریب تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنی ۵ جولائی ۱۹۷۷ کی تقریر میں خود تسلیم کیا تھا کہ تین شہروں میں مارشل لاء ایک لنگڑا مارشل لاء تھا۔ اسی طرح سانگھڑ کا ڈرامہ بھی چیف آف آرمی اسٹاف کی شراکت کے ساتھ رچایا گیا تھا۔

پی این اے نے مذاکرات کو نئے سرے سے شروع کرنے کا اقدام چیف آف آرمی اسٹاف کے حکم ہی پر کیا تھا۔ وائٹ پیپر کو پی این اے کی پردہ پوشی کرنا ہی ہے۔ پی این اے کا دفاع خود موجودہ حکمرانوں کا دفاع ہے۔ آخر ان کے کون سے مفادات مشترک تھے۔ اور با قاعدہ نکاح کی نوبت کیوں کر پہنچی؟ دراصل چیف آف آرمی اسٹاف عرصے سے مودودی اور جماعت اسلامی کے معتقد اور پیروکار تھے۔ وہ امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد کے رشتہ دار اور جالندھری بھائی ہیں۔ دونوں کی سوچ انتہائی رجعت پسندانہ ہے۔ اگر چہ ان کی مشترکہ عادات سے سب واقف

ہیں مگر ایک خودغرض اور موقع پرست شخص محض اسی قدر مشترکہ مفاد کی بنا پر ایسی دوہری سازش تیار نہیں کرے گا۔ وہ چیف آف آرمی اسٹاف کے اہم عہدے پر فائز تھا۔ اسے پے در پے ترقیاں دی گئی تھیں اور میری حکومت کا ناشکر گزار ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس دوہری سازش میں شریک ہونے (ایک پی این اے کے ساتھ اور دوسرے میری حکومت میں) کے لئے محض میاں طفیل محمد سے رشتے داری اور مودودی سے عقیدت مندی کافی نہ تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خفیہ ہاتھ ان سب مختلف راہوں کے مسافروں کو ایک ہی کشتی میں لا بٹھاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وائٹ پیپر غیر ملکی مداخلت کے الزام کی تردید کے لئے اتنا تردد کرتا ہے اور پی این اے کے دفاع کے لئے مارا ماری کرتا ہے۔

اگر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس گھٹیا کاروبار میں اس طرح ملوث نہ ہوتا تو وہ پی این اے کے غیر ملکی تعلقات کے سلسلے میں ایک شریکِ جرم والی پریشانی کا اظہار نہ کرتا۔ وائٹ پیپر میں پی این اے کے خلاف الزامات کی پوری شدت سے تردید کی گئی ہے اور اس کی معصومیت کو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا ہے۔

انتخابات پی این اے اور پیپلز پارٹی کے درمیان ایک زوردار مقابلہ تھا۔ اگر انتخابات کا انعقاد محض حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن کی ذمہ داری ہوتی تو انتخابات کی بجائے اس کا کچھ اور نام ہوتا۔ انتخابات کا انعقاد حکمران جماعت اور اپوزیشن جماعت یا جماعتوں کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ الیکشن کمیشن اس میں ریفری ہوتا ہے اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وہ محض میدان سے باہر کھڑا ایک غیر جانبدار مبصر ہوتا ہے۔ اگر ''پی این اے نے انتخاب کیسے لڑا اور مطلوبہ فنڈز کیسے جمع کئے'' اس وائٹ پیپر کا موضوع نہیں تو پھر 'پیپلز پارٹی نے انتخاب کیسے لڑا اور فنڈز کہاں سے جمع کئے' بھی اس کا موضوع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اپوزیشن بائیکاٹ کر دیتی تو الیکشن ہو ہی نہ سکتے تھے۔ انتخابات کے انعقاد کا سوال پیدا ہی تب ہوتا ہے جب فریقین میں مقابلہ ہو۔ دونوں طرف کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آتی ہیں۔ یہ انتخاب حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن میں تو نہیں تھا، جس میں پی این اے محض خاموش تماشائی ہو۔

تشبیہوں کا ایک مرتبہ پھر استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاک بھارت جنگ ایسا معاملہ نہیں جو بھارت اور ریڈ کراس کی ذمہ داری ہے جس میں پاکستان موضوع سے خارج ہو۔ یا ایک عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ مقابلہ محمد علی اور ریفری کا مسئلہ نہیں ہو سکتا، جس سے دوسرا باکسر خارج ہو۔

نتیجہ یہ ہے کہ فوجی ٹولہ بالکل بے نقاب ہو چکا ہے۔ کوئی بھی اس احمقانہ موقف کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ انتخابات کے بارے میں وائٹ پیپر میں پی این اے کی لاقانونیت' زیر بحث نہیں آ سکتی۔ یہ بالکل نا قابلِ قبول ہے۔ تاہم یہ موقف کہ وائٹ پیپر بنیادی طور پر میری جماعت اور الیکشن کمیشن کی کارکردگی سے متعلق ہے، اگر چہ قابلِ قبول نہیں، مگر میرے اس دعوے کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اس وائٹ پیپر' کا مصنف اس کی منصوبہ بندی اور اجراء کے وقت کا تعین کرنے والا چیف الیکشن کمشنر ہی ہے۔ میرا رویہ بھی واضح ہے۔ اگر میں نے اس وقت واویلا نہیں مچایا تھا جب میں ملک کا وزیر اعظم تھا اور مجھے شدید اشتعال دلایا جا رہا تھا تو اب جبکہ میں پھانسی کی کوٹھری میں مقید ہوں اور یہ تمام واقعات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں، میں کیوں واویلا کروں۔ میں بیرونی طاقتوں پر نئے سرے سے برس کر حکومت کی چال میں نہیں آ ؤں گا۔

یہ ساری کہانی عام ہو چکی ہے۔ مزید انکشافات ہو رہے ہیں، میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی جیسے پلیٹ فارم سے میں نے قوم کو آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے بعد کی سیاسی تقریروں اور عدالتوں میں بیانات کے ذریعے بھی خبردار کر دیا۔ اب پھانسی کی کوٹھری سے میں پاکستان کی لڑائی لڑ سکتا ہوں۔

۱۲......

مجرم یا سورما

افسر شاہی

وائٹ پیپر میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انتظامی سربراہ اور منتخب رہنما صوبائی اور وفاقی حکومتوں کو افسر شاہی پر کسی قسم کا کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی اور چپکے بیٹھا رہنا چاہیے تھا۔ اسی اصول کی بنیاد پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے افسر شاہی' الیکشن کمیشن' خفیہ ایجنسیوں' وزارت اطلاعات ونشریات کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا۔ یہ ایک انتہائی گھٹیا الزام ہے' یوں لگتا ہے کہ پاکستان کے خود ساختہ اور زبردستی کے حکمران یہ چاہتے ہیں کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں اپنے جائز اختیارات کو ریاستی مشینری کے حوالے کر دیں۔ کیا ہمیں یہ چاہیے تھا کہ اپوزیشن سے یہ درخواست کرتے کہ وہ ہماری جگہ حکومت کرے؟ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اس غیر معمولی تصویر پر ہی بس نہیں کی' اور ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو کوئٹہ ایئرپورٹ پر فرمایا:

> "افسر شاہی کے ادارے کے اپنے فرائض ہوتے ہیں۔
> جہاں تک ہمارے نظام کا تعلق ہے' افسر شاہی کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ
> جانب داری نہیں برت سکتی۔ اگر یہ کسی ایک مخصوص پارٹی سے جانبداری

کرے تو یہ جائز نہیں۔ مسٹر بھٹو نے افسر شاہی کے ادارے کو بے حد نقصان پہنچایا۔ افسر بے چہرہ ہوتے ہیں اور بے غرض بھی۔ وہ کھلے عام جلسوں میں شریک نہیں ہو سکتے' اس لئے جو افسر کسی خاص جماعت یا کسی فرد کے ہاتھوں میں کھیلنے سے انکار کردے یا غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتے' اسے ان دنوں ناپسند کیا جاتا ہے۔''

(پاکستان ٹائمز ۲۸ جولائی ۱۹۷۸ء)

مجھے ان سے اتفاق ہے۔ افسر شاہی کا واقعی اہم کردار ہے' مگر مارشل لاء کے تحت۔ یہ اہم کردار میرے' میرے خاندان اور میری پارٹی کے رہنماؤں کے خلاف جھوٹی شہادتیں گھڑنے کا ہے' فوجداری مقدمات اور نااہلیوں کے ٹریبونلوں کے سامنے گواہوں کے طور پر بھگتنے کا ہے۔ افسروں کو اس اہم کردار کو ادا کرنے کا معقول معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ اگر انکار کریں تو ان کو سزائیں دی جاتی ہیں اور جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اس ملک کی تاریخ میں کبھی افسر شاہی کو اس قدر مکروہ کردار ادا کرنے کے لئے نہیں کہا گیا' جیسا آج کل ادا کرنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ افسر شاہی اب کوئی ادارہ نہیں رہا۔ سرکاری افسر حکمرانوں کی من مانی کی تسکین کے لئے ٹرانسفر یا برطرف کر دیے جاتے ہیں۔ یہی ان کی غیر جانب داری ہے۔ ہاں' بے چہرہ لوگ ضرور ہیں' مگر جیلوں میں۔ اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''منتخب برہمنوں'' کو مشیر اور وزیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ ماضی میں چند افسر اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز رہے ہیں مگر وہ انتخابی عمل سے گذر کر وہاں پہنچے تھے۔ ایک سابق افسر وزیراعظم بھی بن گیا مگر وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا منتخب قائد ایوان تھا۔ ایک اور ریٹائرڈ افسر ملک کا صدر بنا مگر وہ بھی منتخب ہوا تھا۔ ایک زمانے میں (سابق وزیر داخلہ بھارت) ولبھ بھائی ٹپیل (وزیراعظم) مرارجی ڈیسائی دونوں انڈین سول سروس میں ہوا کرتے تھے مگر انھوں نے استعفےٰ دے کر جنگ آزادی میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ ایوب خان یا یحییٰ خان نے بھی اپنے مارشل لاؤں میں سرکاری افسروں کو وزیر نامزد نہیں کیا تھا۔ میری حکومت میں دو سرکاری افسر شامل تھے مگر دونوں نے سینیٹ کا

انتخاب جیتا تھا۔ ہماری تاریخ میں پہلی مرتبہ موجودہ غیر نمائندہ حکومت نے افسروں کو مشیروں اور وزیروں کے طور پر مقرر کیا ہے۔ ان میں سے ایک تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے عملاً وزیراعظم ہے۔ یہ ہے وزیروں اور مشیروں کی کرسیوں پر قابض نام نہاد بے چہرہ' بے غرض اور غیر جانب دار افسروں کی حقیقت۔

ان بنیادی تضادات اور نقائص سے قطع نظر ایک اہم اور اعلیٰ عمومی اصول توجہ کا طالب ہے۔ اس اصول پر بات کرتے ہوئے میں ایک پارٹی سسٹم والی ریاستوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ میرے ذہن میں مختلف پارٹیوں والا جمہوری نظام ہے۔ بہت سی پارٹیوں والے نظام میں بھی مکمل اور شدید علیحدگی قابلِ عمل نہیں ہوتی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اعلیٰ ترین انتظامی عہدے حکمران جماعت پُر کرتی ہے۔ ایک انتظامیہ سے دوسری انتظامیہ کو انتقالِ اقتدار کے لئے امریکی نظام انتخابات کے بعد ہفتوں کا وقفہ دیتا ہے تاکہ اس وسیع تبدیلی پر عمل درآمد ہو سکے۔ پارلیمانی نظام میں بھی سول سروسز اور دوسرے محکمے کوئی جزیرے نہیں ہوتے' جو ایک متوازی حکومت چلا رہے ہوں۔

برطانیہ میں' جو ہم دیسیوں کے لئے نمونہ ہے' بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج کل برطانوی نظام میں خصوصی مشیروں کا ادارہ موجود ہے اور دن بدن وسیع تر ہو رہا ہے۔ وزیراعظم ہیرلڈ ولسن کے دور میں روایت یہ تھی کہ کابینہ کے ہر وزیر کے لئے دو سے زیادہ خصوصی مشیر نہیں رکھے جاتے تھے۔ موجودہ وزیراعظم' جناب جیمز کیلاہان کی لیبر حکومت خصوصی مشیروں کے ادارے میں مزید ترقی دینے پر غور کر رہی ہے۔ سرکاری افسروں کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں آرمٹ ایج کمیٹی نے اس مؤقف سے اتفاق کیا ہے کہ خصوصی مشیروں کو وزیراعظم کے جاری کردہ خصوصی قواعد کا پابند ہونا چاہیے۔ خصوصی مشیروں کے اس ادارے نے ایک بھرپور سیاسی نیٹ ورک تشکیل دے دیا ہے۔ جون ۱۹۷۴ء میں برطانوی حکومت میں اڑتیس خصوصی مشیر کام کر رہے تھے۔ اب اس تعداد کو ایک سو تک لے جانے کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ انھیں' عارضی سرکاری افسر' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تمام دوسرے قوانین کے برعکس' خصوصی مشیر عام سیاسی سرگرمیوں میں

کھلے بندوں حصہ لیتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ سیاست میں شریک عارضی سرکاری افسروں کا یہ ادارہ برطانوی حکومت کا ایک مستقل حصہ بنا رہے گا۔ یہ ہے برطانوی پارلیمانی جمہوریت میں غیر جانب دار بے چہرہ سرکاری افسروں کی صورت حال۔

سرکاری افسروں کی غیر جانبداری (Segregation) کا افسانہ نوآبادیاتی نظام کی ضرورت تھی۔ شہنشاہیت نے سرکاری افسروں کو عوام سے دور رکھنے کے لئے آہنی دیواریں حائل کر رکھی تھیں چنانچہ عوام کے لئے یہ افسر بے چہرہ ہی رہتے۔ ان سرکاری افسروں کو دیسیوں کے باہمی جھگڑوں اور مذہبی یا سیاسی مسائل سے نمٹنے میں غیر جانبداری ہی کی تلقین کی جاتی ہے۔ مگر غیر جانبداری کا یہ ترازو وقتاً فوقتاً برطانوی راج کے مفادات کے مطابق ایک یا دوسرے فریق کے حق میں جھکتا رہتا تھا۔ یہ مکارانہ غیر جانبداری اور بے چہرہ پن سامراجی آقاؤں کے لئے نہ تھا۔ جب راج کے مفادات کے تحفظ کی بات آتی' انڈین سول سروس اور دوسرے شعبے راج کے بنیادی ستونوں کی حیثیت سے ایک خودغرضانہ اور جانبدارانہ چہروں والا کردار ادا کرتے۔ میں ایک پارٹی نظام کی وکالت نہیں کر رہا اور نہ ہی اپنی حکومت کے سروسز سے تعلقات کے سلسلے میں دفاع پیش کر رہا ہوں۔ میں صرف عہدِ حاضر میں حکومتوں اور سول سروس کے مابین موجود حقیقتوں کی مختصر اُوضاحت کر رہا ہوں۔

اگر میں نے عوام کے مفادات کی قیمت پر کوئی اندھا دھند جانبدارانہ پوزیشن اختیار کی ہوتی تو میں انھیں اور ان کے Cause سے دھوکہ دہی کا مرتکب ٹھہرتا۔ اگر میں حکمران جماعت کے جائز مفادات کو نظر انداز کرتا تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی قیادت میں رجعت پسندوں کا جوابی انقلاب کہیں پہلے ریاستی مشینری کو ہڑپ کر چکا ہوتا۔ میں اس آزمائش میں اس لئے مبتلا ہوں کہ میں نے ملک کے شکستہ ڈھانچے کو پھر سے جوڑنے کے متضاد مفادات کے درمیان آبرومندانہ اور منصفانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ درمیانی راستہ' قابلِ قبول حل یا مصالحت محض ایک یوٹوپیائی خواب ہے۔ فوجی بغاوت ظاہر کرتی ہے کہ طبقاتی کشمکش ناقابلِ مصالحت ہے اور اس کا ایک یا دوسرے طبقے کی فتح کی صورت میں ہی نکلنا لازمی ہے۔

ظاہر ہے، عارضی ناکامیوں کے باوجود جدوجہد کا نتیجہ ایک طبقے کی فتح ہی کی صورت میں نکلے گا۔ فوجی بغاوت کے رہنما آنے والے واقعات کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے۔ جس پر ان کے دستخط موجود ہیں۔

لندن میں میرے بیٹے میر غلام مرتضیٰ کے تجزیے اور تبصرے سے خوفزدہ ہونا حماقت ہے۔ رجعت پسندوں کا غیر معمولی ردعمل ان کی بوکھلاہٹ اور احساس جرم کا آئینہ دار ہے۔

ایک رجعت پسند اُردو اخبار اسے یاد دلانا چاہتا ہے کہ جیسے اس کا باپ ہے، ویسے ہی قصوری کا بھی باپ تھا۔ درست، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ قصوری لاس اینجلز، نیویارک اور پیرس میں سرکاری خرچے پر اپنے باپ کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے اور میرے بیٹے میرے بیٹے نہیں ہوں گے جو میرا خون بہانے والوں کا خون نہ پی جائیں۔ یہ میرے بیٹے کون ہیں۔ میرے عوام میرے بیٹے ہیں۔ میر غلام مرتضیٰ اور شاہنواز کو بچپن ہی سے ان کا سچا خادم بننے کی تربیت دی گئی ہے۔

مجھ پر قومی خزانے کے ضیاع کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مارشل لاء کی یہ کم خرچ بالانشین قسم کی حکومت کیا کرتی پھر رہی ہے۔ عوام کی طرف سے کوئی نمائندہ ذمہ داریوں کے بغیر اس حکومت نے اپنے پہلے پھسپھسے سال میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکریٹریٹ کے لئے جو بجٹ تیار کیا ہے، اس کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

(i) چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سکریٹریٹ کے ملازموں کے لئے ٦,٣٢,٥٠٠ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے میرے زمانے میں یہ رقم ٥,٦٧,٥٠٠ روپے تھی۔

(ii) کنٹریکٹ الاؤنس کے لئے ٨,٩٠,٠٠٠ روپے طلب کئے گئے ہیں۔ ایک سال پہلے اس مد میں ٨,٢٥,٠٠٠ روپے مانگے گئے تھے۔

(iii) میرے زمانے میں دوروں کے لئے چار لاکھ کی رقم رکھی گئی تھی۔ موجودہ بجٹ میں بھی وہی رقم موجود ہے حالانکہ اس حکومت کی کوئی نمائندہ حیثیت یا سیاسی ذمہ داریاں نہیں ہیں۔

(iv) سٹاف کی تنخواہوں کے لیے ۶,۱۳,۳۰۰ روپے مانگے گئے ہیں میرے ''شاہ خرچیوں'' کے دور میں یہ رقم ۳,۶۵,۰۰۰ روپے تھی۔ اور ایک سال کے غیر جمہوری دور میں اس مد سے ۵,۹۶,۵۰۰ روپے سے زائد خرچ بھی کیا جاچکا ہے۔

(v) سٹاف الاؤنس کے طور پر میرے زمانے میں تین لاکھ نوے ہزار روپے کی رقم رکھی گئی تھی جو اس سال بڑھ کر چھ لاکھ اٹھانوے ہزار تین سو روپے ہوگئی ہے۔

(vi) اس سال مارشل لاء سیکریٹریٹ سے منسلک نیا حفاظتی یونٹ ۸۳,۰۰۰ روپے کھا جائے گا۔

(vii) خفیہ سروس کا بجٹ ۱۰,۰۰,۰۰۰ روپے اس حفاظتی یونٹ کے علاوہ ہے۔

(viii) میرے جیسے ''پکاڈلی کے شہزادے'' نے گذشتہ سال اپنے دور حکومت میں ۸۹,۱۶,۰۰۰ روپے ضائع کئے تھے۔ مگر اس سال چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سکریٹریٹ پر ۱,۰۶,۴۸,۰۰۰ روپے خرچ کئے جارہے ہیں۔ اور اس رقم میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور اس کے معاونوں کی تنخواہیں اور الاؤنس شامل نہیں ہیں۔

(ix) میرے برے زمانے میں انٹیلی جنس بیورو — ۳,۵۶,۷۸,۰۰۰ روپے کھا جاتا تھا۔ مگر آج کے اچھے دنوں میں ۳,۸۵,۶۴,۰۰۰ روپے اس کی خوراک ہیں۔

یہ اعداد وشمار اپنی کہانی خود سنار ہے ہیں۔

آج کل جبکہ چانڈیوسرداروں کی حیثیت اورمرتبے تک کا مذاق اڑایا جارہا ہے' میں اس دعوے کی جسارت نہیں کروں گا کہ ۱۹۵۸ء میں وفاقی وزیر بننے سے قبل میں کوئی مفلس نہیں تھا۔ ادائیگیوں کے توازن میں مستقل خساروں کے باعث وزارتِ تجارت کا قلمدان ہمیشہ بڑا پرکشش رہا ہے۔ اور میں تو صدر ایوب کے ''سنہری دور'' میں وفاقی وزیر تجارت بنا تھا۔ یہ وزارت بس سونے کی کان تھی۔ اگر ایوب خان کے بیٹے راتوں رات لکھ پتی بن سکتے تھے' تو میرا دوسرا بیٹا بھی مارشل لاء کے بعد ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ 'لٹیرے شرفاء' زمانہ تھا' جب وزیر بیک وقت اسلام آباد میں وزیر خزانہ اور امریکہ میں عالمی بینک کے ایگزیکٹوڈائرکٹر کے عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اسی پہلے مارشل لاء کے زمانے میں منظم اور وسیع پیمانے کی بدعنوانیوں کا آغاز ہوا تھا۔ ''سنہری دور'' دراصل سرکاری سالوں کا دور تھا۔ میں وعدے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا کردار ان سب آلائشوں سے پاک تھا۔ میں حکومت کے ان چند رہنماؤں میں سے میں تھا' جن کا دامن صاف تھا۔ مارشل لاء لگے چند ماہ گذرے تھے۔ کراچی کی ایک تقریب میں ایک گستاخ صنعت کار نے مذاق مذاق میں فقرہ کسا کہ مارشل لاء بلیک مارکیٹنگ کو کیا روکے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ بھی بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ اس کا جواب تھا۔ ''جناب' سچ بات تو یہ ہے کہ کرتا ہوں ...... ورنہ میرا کاروبار ٹھپ ہو کے نہ رہ جائے گا'' میں نے وہیں اور اسی وقت اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس خبر کو پاکستان میں دبا دیا گیا مگر یہ نیویارک ٹائمز میں چھپی۔ تاہم صنعت کار ایک گھنٹے کے اندر اندر رہا کر دیا گیا کیونکہ ایک معمولی نوجوان وزیر تجارت کے جوش وخروش سے تجارتی برادری کے خوفزدہ اور نجی سرمایہ کاری کی فضاء خراب ہو جانے کا خدشہ تھا۔

بعد میں جب میں ایندھن' بجلی اور قدرتی وسائل کا وزیر بنا تو یہ ایک اور سونے کی کان تھا۔ اس حیثیت میں میں نے پاکستان میں مغربی تیل کمپنیوں کی گلا گھونٹنے والی گرفت توڑی۔ میں نے پاکستان سے تیل کی سلطنت کے دو غیر ملکی نمائندوں کے اخراج کے احکامات جاری کئے کیونکہ وہ نفرت انگیز بدعنوانیوں اور اقتصادی وزارتوں کے اعلیٰ افسروں کو رشوت دینے کی وارداتوں میں ملوث تھے۔ میں نے دسمبر ۱۹۶۰ء اور مارچ ۱۹۶۱ء میں سوویت یونین سے تیل کا معاہدہ کیا۔ اس

کے بعد میں صنعت کا وزیر بنا تو یہ سنہری دروازوں والی سنہری کان تھی۔ انتہائی تن دہی کے ساتھ میں پبلک سیکٹر کی طرف متوجہ ہوا اور پی آئی ڈی سی کی ترقی پر دھیان دیا۔ کچھ عرصے بعد ۲۲ خاندانوں اور ان کے سرپرست وزیر خزانہ نے مجھے بڑی کوشش سے اس وزارت سے ہٹوایا کیونکہ بدعنوانیوں کے خلاف میری تحقیقات کی ضرب ان پر پڑنے لگی تھی۔

تو یہ افسانوی دو تین کروڑ روپیہ ان پیش کشوں کے مقابلے میں کیا ہے جن کو میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے اکتوبر ۱۹۶۳ء اور دسمبر ۱۹۶۵ء کے درمیان حقارت سے ٹھکرا تا رہا تھا۔ میں کوئی پی این اے کا لیڈر نہ تھا کہ اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کا سودا کر لیتا۔ ۱۹۶۵ء کے موسم گرما میں جب میں اور میری بیوی پیرس میں تھے تو ہمیں ایک دعوت میں مدعو کیا گیا۔ ایک بہت اہم اور امیر ہمسایہ مسلم ملک کی شہزادی بھی مدعو تھیں۔ انھوں نے مجھے دعوت کے بعد اپنی رہائش گاہ پر آنے کو کہا۔ ہم ان کی شاندار رہائش گاہ پہنچے اور ان سے پاکستان اور علاقے کی سیاست پر گرما گرم بحث کرتے رہے بعد میں کھانے کے دوران اور کار میں بھی گفتگو جاری رہی۔ شہزادی نے ہیرے کا ہار پہنا ہوا تھا۔ ہیرے کی شکل چٹان کے ٹکڑے جیسی تھی۔ کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں کافی کے لئے گئے۔ میری بیوی اور میں ایک کونے میں شہزادی اور ان کی دو میز بانوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ انھوں نے گفتگو جاری رکھی، جو بڑی جاندار ہو گئی تھی۔ شہزادی سوچ میں ڈوبی لگ رہی تھیں۔ وہ خیالوں میں گم اپنے ہار سے کھیل رہی تھیں۔ پھر اچانک کہنے لگیں۔

''دیکھو ذوالفقار! اگر تم پاکستان کے صدر بن گئے تو میں تمہیں یہ ہار تحفے میں دے دوں گی'' اور انھوں نے اپنی انگلیاں ہیرے پر رکھ دیں۔

ہم سب خوب ہنسے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ سالہا سال بعد جب میں صدر پاکستان کی حیثیت سے ان کے عظیم ملک میں گیا تو شہزادی نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے محل میں دعوت دی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ دیر بعد شہزادی ایک پیکٹ لائیں اور مجھے کھولنے کو کہا۔ میں نے پیکٹ کھولا تو اندر سے وہی ہیرے کا ہار نکلا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے لئے اسے قبول کرنا ناممکن ہے مگر ان کا اصرار تھا کہ ''ہم اپنے وعدے نہیں توڑا کرتے'' بمشکل تمام بات شہزادی کی سمجھ میں آئی اور

مجھے ان کی منت کرنا پڑی کہ وہ یہ بیش قیمت ہار اپنے پاس رکھیں۔لیکن میں نے انھیں بتایا کہ ان کا یہ رویہ تحفے سے بڑا تحفہ تھا اور ہیرے سے کہیں زیادہ بیش قیمت۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے دوران جب میں لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو ایک غیر ملکی مجھ سے ملنے آیا۔تعارف اور دوسری رسمی باتوں کے بعد اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ملک کے صدر کی جانب سے انتخابات میں امداد کی پیش کش لے کر آیا ہے۔اور میرا ردعمل بھلا کیا تھا؟ پورے چار روز بعد لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل میں وکلاء کے ایک استقبالیے میں میں نے اس صدر کو مڈل ایسٹ کے راجر پلان کو قبول کرنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔اس تقریر کے کوئی ہفتہ بھر بعد اس ملک کا سفیر مجھ سے میری کراچی کی رہائش گاہ پر ملنے آیا۔اس نے بتایا کہ اس کے صدر نے میری تقریر پڑھی ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں نے ان کا دل توڑ دیا ہے۔میں نے سفیر سے کہا کہ اپنے صدر سے بصد احترام یہ عرض کر دیں کہ انھوں نے بھی "میرا دل توڑ دیا تھا۔" ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔تازہ ترین مثال اکتوبر ۱۹۷۶ء میں سعودی عرب کے شاہ خالد کے دورہ پاکستان کی ہے۔انھوں نے مجھے ایک رولز رائس کار کا تحفہ دیا اور اصرار کیا کہ یہ ذاتی تحفہ ہے ایک شخص سے دوسرے شخص کو۔میں نے اس فراخ دلانہ تحفے پر شاہ کا بے حد شکریہ ادا کیا مگر کار کو بلا تاخیر سرکاری ملکیت کے طور پر رجسٹر کر لیا گیا۔اگر غلام محمد شاہ ابن سعود سے تحفے میں ملی کیڈلک ہضم کر سکتا تھا تو میں بھی رولز رائس رکھ سکتا تھا۔میں کوئی فرشتہ تو نہیں...... مگر اتنا گنہ گار بھی نہیں جتنا فوجی ٹولہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔مجھے اس قسم کی مثالیں دینے کا شوق نہیں مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔حکومت اپنا توازن کھو بیٹھی ہے اور مجھے اپنا دفاع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مثالیں تو دینا ہی ہیں۔ان تمام سالوں میں میں اپنی عزت کی حفاظت کرتا رہا ہوں۔مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں میں ان کا اعتراف عظیم جلسوں میں بھی کرتا رہا ہوں۔مجھ میں ہزار خامیاں ہو سکتی ہیں۔مگر میں بدعنوان نہیں۔اس قسم کے بہتان میرے لئے بہت تکلیف دہ ہیں مگر ایسے بہتان تراشنے والوں کو صلہ ضرور ملے گا۔میرے اذیت رسانوں نے پاکستان کی عزت سے کھیلا ہے۔اب یہ فیصلہ تو تاریخ کرے گی کہ میرا نام برصغیر کے مجرموں کے ساتھ آئے گا یا ان سورماؤں کے ساتھ جنھوں نے اس سرزمین پر کارنامے انجام دیئے۔میرا نام اور میری شہرت عوام اور تاریخ کے سینے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔

۱۳.

ہلکی پھلکی موسیقی اور سمفنی

خارجی داخلی تعلقات

یہ میرا فرض ہے کہ بین الاقوامی امور کے میدان میں قومی مفادات کے منافی معاملات پر گفتگو کروں۔

پاک افغان تعلقات

افغانستان کے بارے میں کبھی نرم' کبھی گرم پالیسی نہیں چلے گی۔ تین سو برس پرانے مسئلے کے پیچیدہ جال کو شالیمار باغ میں صدر داؤد کا ہاتھ اٹھا کر یا افغان سفارت خانے کی تقاریب میں شرکت کر کے صاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بہت زیادہ کی ضرورت ہے۔

آئندہ حالات دو اہم واقعات سے منسلک ہیں۔ ایک حیدر آباد ٹریبونل کو غیر مشروط اور یک طرفہ طور پر توڑنے کا فیصلہ اور دوسرا انقلاب افغانستان۔ حکومت' افغانستان کی نئی حکومت کا اعتماد حاصل نہیں کر سکی۔ اور صورتحال کو ناگزیر تباہی سے بچانے کے لئے اسے میری حکومت کے کارناموں کا سہارا لینا پڑا ہے۔

شدید مسائل اور کھچاؤ کے تھکا دینے والے سلسلے کے بعد جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتے میں سابق صدر افغانستان' سردار داؤد محمد خان نے مجھے کابل کا دورہ کرنے اور افغانوں کے بقول ''پاکستان اور افغانستان کے درمیان واحد سیاسی اختلاف'' کو بات چیت کے ذریعے طے کرنے کی دعوت دی۔ کابل کی تفصیلی بحث کا ماحصل یہ تھا کہ افغان ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے سے قبل نیپ کے ان راہنماؤں کی رہائی چاہتے تھے' جن پر حیدرآباد میں سپیشل ٹربیونل میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے اصرار کیا کہ دونوں اقدامات بیک وقت ایک مجموعی سمجھوتے کی شکل میں کئے جائیں۔ گو مذاکرات نتیجہ خیز نہیں رہے تھے مگر یہ طے پایا تھا کہ سابق صدر افغانستان مذاکرات کو جاری رکھنے کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ تاہم میرے دورۂ کابل کے خاتمے پر بنڈونگ (غیر جانبداری) کے پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں کی بنیاد پر ایک تاریخی مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ جب صدر داؤد اور ان کا وفد اگست ۷۶ء میں پاکستان پہنچا تو کابل مذاکرات کے معاملات کو راولپنڈی کی گفت وشنید میں آگے بڑھایا گیا۔ پہلے دور کے بعد پاکستان اور افغانستان کے وفود کو ان کے رہنماؤں کی طرف سے بیک وقت مجموعی سمجھوتے کا فارمولا تیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ راولپنڈی سے دونوں رہنما اور وفود لاہور گئے۔ جب صدر داؤد کا شالیمار باغ میں گرم جوشی سے استقبال کیا جا رہا تھا' دونوں وفد ایک تحریری فارمولا تلاش کرنے کے لئے رت جگا کر رہے تھے۔ فارمولا بالآخر تلاش کر لیا گیا۔ اس میں افغانستان کی طرف سے ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر تسلیم کرنے اور اسی وقت پاکستان کی طرف سے نیپ رہنماؤں کی رہائی اور عام معافی کے اعلان کے لئے کہا گیا تھا۔ اس وقت کے وزیر ریاست برائے امور خارجہ مسٹر عزیز احمد اس تحریری فارمولے کو لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں میری آخری توثیق کے لئے لائے۔ میں نے فارمولے کا مطالعہ کیا اور کہا۔ ''میں مطمئن ہوں'' صدر داؤد بھی مطمئن تھے۔ معاہدے پر دستخطوں کے لئے کابل میں رسمی تقریب ہونے والی تھی مگر بعد کے واقعات نے دورۂ کابل کو ناممکن بنا دیا۔

صدر داؤد مارچ ۱۹۷۸ء کے شروع میں دوبارہ پاکستان آئے۔ مگر اس مرتبہ وہ پہلے

سے کہیں زیادہ پراعتماد تھے۔ یہ پاکستان اس پاکستان سے مختلف تھا جس کا انھوں نے اگست ۱۹۷۶ء میں دورہ کیا تھا۔ پنڈولم ان کے حق میں گھوم چکا تھا۔ میرا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر تنکے کا سہارا لینے کی کوشش اور ولی خان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش میں، فوجی حکومت ولی خان وغیرہ کو مساوی جوابی اقدامات کے بغیر ہی رہا کر چکی تھی۔ ''سیاسی اختلاف'' وہیں کا وہیں تھا۔ اس نئی صورتحال نے بلوچ اور پختون رہنماؤں کو نہ حل ہونے والے اختلافات کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فوجی حکومت نے مجوزہ معاہدے کو لا حاصل مقاصد پر قربان کر دیا ہے۔ یہ سوچنا حماقت ہے کہ نیپ فوجی ٹولے سے تعاون کرے گی۔ اس کا مطلب، ان جہاں دیدہ لیڈروں کی سیاسی موت ہوگا۔

جنرل ضیاء الحق نے صدر داؤد سے دو ملاقاتیں کیں، ایک کابل میں اور دوسری پاکستان میں، صدر داؤد کا تختہ الٹے جانے سے قبل معاہدے کے خاکے کو باقاعدہ معاہدے کی شکل دینے کے مواقع گنوا دینے کے بعد اب فوجی حکومت افغانستان کے انقلاب سے بوکھلا اٹھی ہے۔ افغانستان کی ہلچل پر بدسلیقہ ردعمل کے بعد اب ازالے کی کوششیں کر رہی ہے۔ نئی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے غیر ضروری طور پر تاخیر کی گئی۔ انتہائی غیر دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغان انقلاب پر حملوں اور پی این اے میں اپنے کاسہ لیسوں کے دشمنانہ بیانات کو مقبوضہ پریس میں نمایاں جگہ دلوائی گئی۔

اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے حکومت اپنی فوجی بغاوت اور انقلاب افغانستان میں تمیز کرنے میں ناکام رہی۔ اگر چہ اس انقلاب کی قیادت مسلح افواج ہی نے کی تھی۔ مگر نئی حکومت کی باگ سویلین پارٹی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاست کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ موجودہ افغان حکومت پاکستان کی کمزوریوں اور حماقتوں سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ فریب خوردگی کا پرندہ اڑ چکا ہے۔ فوجی حکومت ایک دن دھمکیاں دیتی ہے، دوسرے دن خوشامد پر اتر آتی ہے۔ اور بغیر کسی بنیاد کے عمارت تعمیر کرنے والوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔ بہر حال، اس کے اثرات لازمی طور پر ایران اور بھارت تک پہنچیں گے۔ جیسے ڈیورنڈ

لائن کے دونوں طرف مسلمان بستے ہیں، ویسے ہی ایران اور بھارت میں بھی مسلمان ہیں۔ غلط اقدامات اور خام فیصلے قرنِ افریقہ کی ہلکی پھلکی موسیقی کو سمفنی میں بدل دیں گے۔

افغانستان اور پاکستان کے تعلقات پھر نقطۂ آغاز پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ اس لئے زیادہ المناک ہے کیونکہ ناخوشگوار تعلقات کا یہ باب ختم ہونے ہی کو تھا۔ جب جنرل کابل گیا تو وہ خارجی معاملات اور امور سیاست میں اب سے کہیں زیادہ اناڑی تھا۔ ماہرین ایک طرف کھڑے رہے اور جنرل کو کائیاں افغان ڈپلومیٹوں سے سفارتی دنگل کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ قدرت کی شوخیاں بڑی سنگدلانہ ہوتی ہیں۔

کابل روانہ ہونے سے قبل میں نے حکومت کے سرکردہ ارکان کی پاک۔ افغان تعلقات کے مستقبل کے بارے میں رائے لینے کے لئے پشاور میں کانفرنس طلب کی تھی۔ چیف آف آرمی سٹاف نے کہا تھا کہ وہ کانفرنس کا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ''نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے'' انھوں نے اپنی مختصر اور عاجزانہ مداخلت کو یہ کہہ کر ختم کیا تھا کہ انھیں یقین ہے کہ افغانستان سے آئندہ مذاکرات میں پاکستان کے مفادات اس سے بہتر ہاتھوں میں نہیں ہو سکتے۔ یقیناً ''نیم حکیم خطرۂ جان ہوتا ہے۔'' مگر شیکسپئر کے اقوال کو کون پوچھتا ہے؟

پاک بھارت تعلقات

یہاں بہت سے سوال اٹھتے ہیں۔ مثلاً میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ برطانوی وزیراعظم کو دیئے گئے استقبالیہ میں بھارت کو ''پیارا اور بڑا ہمسایہ'' کہنے کی کیا تک تھی؟ یا پھر یہ کہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں جنرل ضیاء نے '' کچھ لو، کچھ دو'' کا مصلحت آمیز جملہ کیوں دہرانا شروع کر رکھا ہے؟ بھارتی تسلط کا مقابلہ سلال ڈیم اور راجستھان نہر کے ذریعے کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ راجستھان نہر ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ ایک زرعی منصوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک ایسی فوجی مورچہ بندی ہے جو پاکستان کی مورچہ بندیوں کو (بشمول بی آر بی کنال) بالکل معمولی بنا دیتی ہے۔ راجستھان نہر جدید میگنیٹ لائن ہے۔ چار سال تک میری حکومت ایرانی حکومت کو اس مقصد کے

لیے بھارت کو قرضہ دینے سے روکے رہی۔ اگر موجودہ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لیتی تو وہ بھی ایسا کر سکتی تھی۔

بھارت اور پاکستان کو درپیش اہم ترین مسئلہ کشمیر کا ہے۔ اسی سلسلے میں شملہ میں اہم اقدامات کئے گئے تھے۔ اسی لئے میکاویلیائی مقاصد کے تحت کشمیر پر ''خفیہ شق'' کی موجودگی کی گپ۔ مقبوضہ پریس اور وزارت اطلاعات کے تنخواہ دار صحافیوں نے بڑے مزے سے اڑائی۔ حکومت کو معلوم ہے کہ ایسی کسی شق کا وجود نہیں۔ اس کے باوجود اس جھوٹ کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

مقصد صاف ہے۔ میرے کاندھوں پر بندوق رکھ کر اطاعت پسندی کی راہ ہموار کرنا۔ اگر ۱۹۷۳ء کے معاہدہ شملہ میں کشمیر پر خفیہ شق موجود ہوتی تو بہت پہلے اس کو افشا کر دیا جاتا۔ اندرا گاندھی انتخابی مہم کے دوران اس کا انکشاف کر دیتی۔ جنتا حکومت اقتدار سنبھالنے کے بعد اسے جاری کر دیتی۔ اگر ایسی خفیہ دفعہ تھی تو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی فوجی بغاوت کے بعد فوجی حکومت نے اس کا اعلان کیوں نہ کیا۔ اس وقت تو شاندار داستانوں کا انبار لگا دیا گیا تھا۔ تب یہ کہانی کیسے بچی رہی۔ حتیٰ کہ جب فروری ۱۹۷۸ء میں بھارتی وزیر خارجہ مسٹر باجپائی پاکستان کے دورے پر آئے تو انھوں نے بھی ایسے کوئی انکشافات نہ کئے۔ گول مول بیان دینے کی بجائے وہ خفیہ معاہدے کا متن پیش کر دیتے اور زور شور سے اعلان فرما دیتے' معاف کیجئے' حضرات' بھارت اور پاکستان دونوں' گذشتہ حکومتوں کے اس خفیہ معاہدے کے پابند ہیں جو میں آپ کے اور دنیا کے تسلیم کرنے کے لئے پیش کر رہا ہوں۔''

مسٹر باجپائی نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس انھوں نے اس شملہ معاہدے پر ہی زور دیا' جس شکل میں وہ جون ۱۹۷۲ء میں منظور ہوا اور جیسا کہ آج تک برقرار ہے۔ نہ کم' نہ زیادہ۔

اس گپ کی تشہیر کے دو مقاصد تھے۔ اوّل یہ کہ اس نام نہاد ''خفیہ مفاہمت'' کے مطابق تنازعۂ کشمیر اب اقوام متحدہ میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ دوم یہ کہ شملہ معاہدے میں ''جنگ بندی لائن'' کو کنٹرول لائن تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ شملہ معاہدے میں ایسی کوئی بات نہیں جو پاکستان کو اقوام

متحدہ میں یہ مسئلہ اٹھانے سے روک سکے۔ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے گذشتہ تیس سال سے ہے۔ اور ابھی تک حل طلب ہے۔ پیپلز پارٹی حکومت یہ چاہتی تھی کہ دوبارہ اقوام متحدہ میں جانے سے پہلے باہمی مفاہمت کی ہر ممکن کوشش آزمالی جائے۔ یہ پیپلز پارٹی کے دوطرفگی کے اصولوں کے نظریئے کے مطابق تھا۔ کشمیر کا مسئلہ اب بھی اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر ہے۔ یہی حقیقت کہ پیپلز پارٹی حکومت نے کشمیر کو مسلسل اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر رکھا' اطاعت پسندی کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے کافی ہے۔ آج بھی اقوام متحدہ متنازعہ لائن کی نگرانی کر رہی ہے۔ گوفنڈز کی کمی درپیش ہے۔ اگر شملہ معاہدے میں اقوام متحدہ کو کشمیر کے مسئلہ میں دخل دینے سے روکنے پر سمجھوتہ ہوا ہوتا تو اقوام متحدہ کی فوج وہاں سے ہٹ چکی ہوتی۔ پیپلز پارٹی حکومت کے دور میں بھارتی حکومت کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ اقوام متحدہ سے اپنی فوج متنازعہ لائن سے ہٹانے کی درخواست کرے۔

۱۹۷۶ء کے موسم سرما میں ڈنمارک کے وزیر دفاع نے کشمیر کے دونوں طرف متعین ڈینش دستوں کا دورہ کیا۔ تاہم حال ہی میں بھارتی وزارتِ داخلہ (غور فرمایئے' وزارتِ خارجہ نہیں!) کے ایک ترجمان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب جنرل ضیاء بھارت کا دورہ کریں گے تو اقوام متحدہ کے مبصروں کی واپسی کا مطالبہ ''بہتر ہوتے ہوئے تعلقات'' کی روشنی میں کیا جائے گا۔ جہاں تک جنگ بندی اور کنٹرول لائنوں کے فرق کا تعلق ہے' دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ جنگ بندی لائن ایک کنٹرول لائن ہے جبکہ کنٹرول لائن ایک طرح کی جنگ بندی لائن ہی ہے۔ یہ آپس میں تبدیل ہونے والی اصطلاحیں ہیں۔ اعتراض یہ نہیں کہ جنگ بندی سے کنٹرول لائن کیوں بنایا جا رہا ہے۔ کیونکہ گذشتہ ۲۵ برس سے جنگ بندی لائن کی اصلاح اس قدر کثرت اور اصرار سے استعمال کی گئی ہے کہ اپنا مفہوم کھو بیٹھی ہے اس کی جگہ کنٹرول لائن کا نام استعمال کرنے سے لائن کا متنازعہ کردار نمایاں ہو گیا ہے اور اس میں جان پڑ گئی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ پاکستان کے مقبوضہ پریس کے ذریعے بھارتیوں کی رہنمائی کی جا رہی ہے کہ وہ ان اصطلاحوں کی جو دراصل پاکستان کے مفاد میں تھیں' اپنے فائدے کے لئے تعبیر کریں۔ یہ قوم کے بنیادی مفادات سے انحراف نہیں تو اور کیا ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان ''بڑھتے ہوئے تعلقات'' ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے کافی ''بڑھے'' ہیں۔ مثلاً

(i) باجپائی کا دورۂ پاکستان

(ii) آغا شاہی کا دورۂ بھارت

(iii) سلال ڈیم کا معاہدہ

(iv) تجارتی وفود؛ آمدورفت کے مذاکرات

(v) ثقافتی اور تفریحی مشن

۱۷ اگست ۱۹۷۸ء کو لیبیا کے نائب صدر کو رخصت کرنے کے بعد اخباری نمائندوں سے راولپنڈی ایئرپورٹ پر غیر رسمی بات چیت کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے لیبیا کے نائب صدر کے اس جملے کی بہت تعریف کی کہ دونوں ملکوں کے اچھے تعلقات شخصیات کی وجہ سے نہیں ہیں۔ اگلے ہی سانس میں؛ جب ان کی توجہ شاہراہِ قراقرم پر بھارتی وزیر خارجہ کے اعتراض کی طرف دلائی گئی؛ جنرل نے بین المملکتی امور میں شخصی معاملات کو دخیل کر دیا اور کہا کہ وہ مسٹر باجپائی کی دل سے قدر کرتے ہیں اور اس موقع پر کوئی مزید تبصرہ نہیں کریں گے۔ جن سنگھ کے اس انتہاپسند رہنما کے لئے یہ دلی قدر کہیں گذشتہ فروری میں تو نہیں پیدا ہوئی تھی۔ جب اسلام آباد میں ان کی دو روزہ ملاقات ہوئی تھی؟

یہ بات کوئی راز نہیں کہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی (بھارتی وزیر خارجہ) کو بھارت کے مسلمانوں سے ازل کا بیر ہے۔ وہ ان کے دشمن نمبر ایک رہے ہیں۔ ان کی جماعت کے فرقہ پرستانہ مقاصد؛ جن کو مسٹر باجپائی بار ہا دہرا چکے ہیں؛ برصغیر پر ہندو تسلط اور راج قائم کرنا ہیں۔ ان کا عوامی کیئریر شدید مسلم دشمنی سے عبارت ہے۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اپنی مرضی کے آپ مالک ہیں۔ مگر اگر لیبیا کے نائب صدر کے فقرے پر وہ اتنے خوش ہوتے ہیں تو پھر شاہراہِ قراقرم جیسے اہم مسئلے پر ذاتی تعلقات کے دخل در معقولات کی کوئی تک نہ تھی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو بلا پس و پیش موقع سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے اعلان کرنا چاہیے تھا کہ بھارت کو اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب شاہراہِ قراقرم جیسے عظیم قومی مفاد کا سوال ہو تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھارت کی کھلی اور توہین آمیز مداخلتِ بے جا کا جواب یہ کہہ کر گول کر جاتے ہیں کہ وہ باجپائی کے لئے دلی جذبات کے اظہار کے علاوہ کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ مگر جب میرے قتل کی روک تھام کی بات آتی ہے تو وہ مبینہ ''غیر ملکی مداخلت'' پر تیغ پا ہو جاتے ہیں۔

شاہراہِ قراقرم کے افتتاح کے دن سے بھارت شاہراہ کی ''غیر قانونی'' تعمیر پر شور وغل مچا رہا ہے۔ لوک سبھا میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ شاہراہ کی تعمیر کے پیشِ نظر وزیر خارجہ کو اس سال اکتوبر میں چین کا مجوزہ دورہ منسوخ کر دینا چاہیے۔ بھارتی وزیر خارجہ نے لوک سبھا کو یقین دلایا کہ وہ چین کے دورے میں پاکستان اور چین ملانے کے لئے بھارتی کشمیر کے ''مقبوضہ'' حصے میں تعمیر ہونے والی ''غیر قانونی'' شاہراہ کی تعمیر کا سوال ضرور اٹھائیں گے۔

بھارتی وزیر اعظم نے سرینگر کا دورہ کرتے ہوئے ایسی ہی بنیادوں پر شاہراہ کی تعمیر پر اعتراض کیا اور کہا کہ جموں و کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور بس۔ اور جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اس مسئلے پر تمام شکوک دور کر دیں اور پاکستان کے عوام کو بتا دیں کہ پاکستان کبھی بھی بھارتی تسلط یا مداخلت کو برداشت نہیں کرے گا تو وہ بوکھلاہٹ میں ساری بات گول کر جاتے ہیں۔ آخر پاک بھارت تنازعہ کسی ڈانس سے تو حل نہیں ہوگا۔

غیر جانبدار کانفرنس

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بلغراد کی غیر جانبدار قوموں کی تیاری کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کرنے سے قبل تمام پہلوؤں پر غور کر لیا گیا تھا؟ کانفرنس میں دوسرے درجے کے شہری کی طرح شریک ہونے سے غیر جانبدار اقوام کی برادری میں پاکستان کی بہت بے عزتی ہوئی ہے انہی مسائل کے پیش نظر میری حکومت نے اگست ۱۹۷۶ء میں کولمبو میں ہونے والی غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے بہت سے غیر جانبدار دوست ملکوں کی تجویز قبول نہیں کی تھی۔ جب جنوری ۱۹۷۶ء میں میں نے سری لنکا کا دورہ کیا تو وزیر اعظم بندرانائکے نے پوچھا کہ جب اتنے

بہت سے غیر جانب دار دوست ملک پاکستان کی مبصر کی حیثیت میں شرکت کے خواہشمند ہیں تو میں کیوں تامل کر رہا ہوں۔ میں نے میڈم بندرانائکے کو بتایا کہ اگر اگست ۱۹۷۶ء میں بھی پاکستان کو غیر جانب دار کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ شکریے کے ساتھ معذرت کر دے گا' کیونکہ پاکستان ایک جانبدار ملک ہے۔ پاکستان سینٹو کا رکن ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان نے سینٹو کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی علاقائی حدود سے باہر ایک فوجی مشق میں حصہ لیا ہے۔ فوجی مشق سکاٹ لینڈ میں نیٹو کے علاقے میں ہوئی۔ کیسی عجیب وغریب بات ہے کہ ایک طرف تو پاکستان سینٹو اور سیٹو کی پہلے کبھی نہ ہونے والی فوجی مشقوں میں حصہ لے کر اپنا جانبدار کردار مضبوط کرتا ہے اور اسی سانس میں جولائی ۱۹۷۸ء کی غیر جانبدار کانفرنس میں محض مبصر کے طور پر شریک ہونے کا خواہش مند ہے۔ یہ ایک انتہائی بنیادی تضاد ہے۔

یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی بطور مبصر غیر جانب دار کانفرنس میں شرکت کو پاکستان کے لئے مثال بنا کر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے غیر جانب دار بلاک کے کسی بھی رکن کے ساتھ علاقائی تنازعے نہ تھے۔ دونوں ملک کانفرنس میں دوسروں کے رحم وکرم پر نہیں بلکہ بنیادی ممبروں کے طور پر شریک ہوتے ہیں۔ مبصر کے طور پر شرکت کر کے پاکستان نے اپنے لئے ایک کمتر حیثیت قبول کر لی۔ ہمارے مبصر ہمسائے اس خاندان کے باقاعدہ رکن اور عزت مندانہ پوزیشن رکھتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے مبصر بن کر شرکت کر سکتے ہیں۔ وہ یورپی ملک ہیں اور اکثر غیر جانبدار ملکوں کو امداد دیتے ہیں۔ وہ ایک بالکل مختلف درجے میں آتے ہیں اور پاکستان کے سلسلے میں ان کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

مگر اہم بات یہ ہے کہ یوگوسلاویہ اور رومانیہ کو بھارت کے اسلامی سربراہی کانفرنس میں زبردستی گھس آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ رباط میں ہونے والی پہلی سربراہی کانفرنس میں بھارت گھس آنے میں قریب قریب کامیاب ہو گیا تھا۔ کانفرنس میں شرکت کے لئے بھارت نے اپنی سات کروڑ مسلمان آبادی کا جواز پیش کیا۔ یہ سوچا جا رہا تھا کہ کانفرنس میں شرکت بھارت کو عرب ر مسلم کاز کے قریب اور اسرائیل سے دور لے جائے گی۔ جو بھی مجبوریاں ہوں'

سیکولر بھارت، جو دراصل ہندو بھارت ہے، پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شامل ہونے ہی والا تھا۔ اگر جانبدار پاکستان غیر جانبدار کانفرنس میں شریک ہوتا ہے تو کیا وہ ہندو بھارت کو آئندہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت سے روک سکے گا۔ اگر ایک مرتبہ اس قسم کی روایت ڈال دی گئی، تو پھر اس کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکے گی۔ ہر ملک اپنی تاریخ کا اسیر ہوتا ہے۔ یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی طرح پرتگال اور ترکی کی مثال بھی ہم پر صادق نہیں آتی۔ پرتگال اب غیر جانبدار بلاک کے تنازعوں میں فریق نہیں رہا۔ اگر اس کا گوا پر قبضہ برقرار ہوتا یا اس نے انگولا اور موزمبیق کو خالی نہ کیا ہوتا تو وہ شرکت کی درخواست نہ کرتا۔ ترکی کی مثال اس قدر درخشاں ہے کہ اس پر کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ بھارت نے کانفرنس میں پاکستان کی دوسرے درجے کی شرکت پر اس لئے رضا مندی ظاہر کی ہے تاکہ پاکستان کو شرمندہ کیا جا سکے اور آئندہ اسلامی کانفرنس میں اپنی شرکت کی بنیاد ہموار ہو سکے۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔

قائداعظم کا بنیادی مؤقف تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرنے کی اہل نہیں۔ قائد نے کانگریس کے مسلمانوں کو پٹھو قرار دیا تھا۔ گاندھی نے قائد کے تجزیے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے کئی ڈیڈ لاک ہوئے اور بالآخر کٹھن جدوجہد کے بعد قائداعظم کا مؤقف پاکستان کی تخلیق کی شکل میں درست ثابت ہوا۔ چنانچہ دوقومی نظریے کے مطابق بھارت مسلمانوں کی حقیقی امنگوں کی ترجمانی کا اہل نہیں ہو سکتا۔

جب اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان کو رباط کانفرنس میں بھارت کی موجودگی پر قریب قریب رضامندی کی حماقت کے خوفناک نتائج کا احساس ہوا تو اس نے خود کو گیسٹ ہاؤس میں بند کر لیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس نے شہنشاہ ایران، سعودی عرب کے شاہ فیصل اور مراکش کے شاہ حسن سے اسے بچانے کی اپیل کی۔ پاکستانی وفد کے باقی ماندہ اہم رکن نائٹ کلبوں میں اپنے غم غلط کرتے رہے۔ مراکش میں پاکستان کے سفیر اکبر طیب جی میزبان بنے ہوئے تھے۔ اور مہمانوں میں آغا شاہی اور یحییٰ خان کے جنرل ڈمولینی میجر

جنرل عمر شامل تھے۔ نائٹ کلب میں جنرل عمر نے مذاق مذاق میں آغا شاہی کا تعارف بطور وزیر خارجہ کرایا۔ شاہی نے جنرل سے کہا کہ وہ ایسا مذاق نہ کریں۔ آج سات برس بعد یہ واحد مذاق نہیں جو حقیقت بن چکا ہے۔

جعلی دستاویزات پر سفر کرنا یا جعلی پاسپورٹ پر کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنا عزت مندانہ نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر جگہ چور دروازے سے گھسا جائے۔ اگر غیر جانبدار کانفرنس اتنی ہی اہم ہے اور اپنی آزادانہ خارجہ پالیسی کی شناخت کی اتنی ہی تمنا ہے تو شریفانہ طریقہ یہی ہے کہ سینٹو کو طلاق دی جائے' صحیح معنوں میں غیر جانب دار ملک بنا جائے اور اونچے سر کے ساتھ غیر جانب دار کانفرنس میں سیدھے دروازے سے مکمل رکن کی حیثیت میں شریک ہوا جائے۔ ہے یا نہیں ہے' نہ گوشت نہ پوست'' کچی آبادی' قسم کی شرکت کا مطلب خود کو طوفان کے حوالے کرنا ہے۔ غیر جانب دار ممالک کی نظروں میں ناپسندیدہ' جانب دار ممالک کے نظروں میں مشکوک اور سوشلسٹ ممالک کی نظروں میں حقیر۔

میں پھر دہراؤں گا کہ اگر پاکستان غیر جانبداری کو اتنا ہی اہم سمجھتا ہے کہ بڑے شامیانے سے باہر کانفرنس میں چوری چھپے بیٹھنے کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تو عزت مندانہ طریقہ یہ ہے کہ غیر جانب دار بن کر اس خاندان کا حقدار رکن بنا جائے۔ اس طریقے سے درجہ بندی کے مروجہ لوازمات پورے کرنے کے بعد پاکستان بھارت کی اسلامی کانفرنس میں گھسنے کی کوششوں کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ ایسے حالات میں ایک جانبدار ملک کو غیر جانبدار کانفرنس میں شرکت کی کوشش نہیں کرنا چاہیے' اگر درجہ بندی کی ایک کارآمد مگر پیچیدہ تعریف کا فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ پھر مختلف حالات میں دوسرے ممالک کو بھی ایسے ہی فائدے اٹھانے سے روک نہیں سکے گا۔ ''جو انصاف چاہتا ہے' اسے انصاف کرنا بھی پڑتا ہے'' یا عام فہم زبان میں یوں کہہ لیں۔ ''جیسی کرنی' ویسی بھرنی''۔

......۱۴

آخری قہقہہ

سبق حاصل کرو

یہ الزام لگانا کہ میری حکومت انتخابات کے بعد خانہ جنگی کروانے کا پروگرام بنا رہی تھی، دروغ گوئی اور گھٹیا پن کی انتہا ہے۔ یہ مکروہ جھوٹ فوجی انقلاب کے بعد گھڑا گیا تھا۔ اور سپریم کورٹ میں بیگم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست میں استعمال کیا گیا۔ میں نے اپنے بیان حلفی میں واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ کانہ جنگی کا ڈھکوسلا بعد میں سوچا گیا تھا۔ مستند جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ تقسیم بڑھ رہی ہے، اس سے بےخبر کہ یہ تقسیم تو ایک ناگزیر تاریخی ارتقاء ہے۔ اور جب تقسیم شدید ہوتی ہے اور اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عوام کی فتح قریب ہے۔ ایسے ہی دور میں مخصوص مفادات کے حلقے بوکھلاہٹ کے عالم میں اپنی بقا کی خاطر عوام کے خلاف فوجی بغاوت کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ ''شیر آیا شیر آیا'' پکارتے ہیں اور پھر شب خون مارتے ہیں۔ اسی لئے پی این اے نے ''شیر آیا شیر آیا'' کا شور مچایا اور جارحیت کا ارتکاب کیا۔ پی این اے کے لیڈروں نے مسلح افواج کو بغاوت پر اکسایا۔ بھاری مقدار میں اسلحہ خریدا، جہاد کا اعلان کرنے کے لیے چھتوں پر چڑھ کر اذانیں دیں۔ پے در پے

ہڑتالوں کی اپیلیں کیں۔ مذاکرات کے ذریعے سمجھوتے کے تمام فارمولے مسترد کر دیئے۔ اور بالآخر اس متفقہ فارمولے سے بھی مکر گئی جو خود اس کی رضامندی سے اور بڑی چھان پھٹک کے بعد تیار کیا گیا تھا۔

اقتدار کا لالی پاپ

میری حکومت نے خانہ جنگی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ یوں بھی' جیسا میں نے بیگم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست کے دوران حلفیہ بیان میں کہا تھا' خانہ جنگی کے اپنے تاریخی اسباب اور اجزاء ہوتے ہیں۔ یہ کسی حکومت کی سیٹی پر شروع نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے عوامی ضمیر کا ایک مطلوبہ سطح تک پہنچنا اور مسلح افواج کا ظالموں اور مظلوموں کے حامی گروہوں میں بٹ جانا ضروری ہوا کرتا ہے۔ جب فوجی ٹولہ مسلح افواج کو مجموعی طور پر مخصوص مفادات کی حفاظتی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا ہو' تو خانہ جنگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں' خانہ جنگی کے لئے معروضی حالات پیدا کرنے کی بجائے حکومت محدود پیمانے پر تشدد اور خون خرابے کا بندوبست کر سکتی ہے۔ مگر ایسا تو اپوزیشن بھی کر سکتی ہے' بلکہ ۱۹۷۷ء میں کر بھی چکی ہے۔ جب خانہ جنگی کے لئے حالات تیار ہوتے ہیں تو پھر فوجی انقلاب اسے نہیں روک سکتے۔ اصل میں فوجی انقلاب خانہ جنگی کے حالات پیدا کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج پاکستان خانہ جنگی کے جس قدر قریب ہے۔ اتنا ۱۹۷۷ء کے موسم بہار کے بدترین دنوں میں بھی نہیں تھا۔ سپریم کورٹ کی درخواست میں میرے ایک خصوصی معاون کے بیانات پر مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر چیف آف آرمی اسٹاف نے فوری' بروقت اور راست کارروائی نہ کی ہوتی تو ملک خانہ جنگی کی آگ میں جل رہا ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ میری اپیل کی سماعت کے دوران اسی خصوصی معاون نے ایک حلفیہ بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اسے میرے خلاف استعمال کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ ۱۹ اگست ۱۹۷۷ء کو ایک جنرل نے جس نے بغاوت کو عملی جامہ پہنا کر چیف آف آرمی سٹاف کے منہ میں اقتدار کا لالی پاپ دیا

تھا'' خانہ جنگی کے اس مبلغ'' سے لندن میں تین گھنٹے تک ملاقات کی۔

گذشتہ چودہ ماہ میں اسپین کی طرح پاکستان میں بھی شدید اور نہ حل ہونے والے تضادات خوفناک حد تک بڑھتے جا رہے ہیں۔ پاکستانی ٹولے کو جنوبی بحیرہ روم کے حالیہ واقعات کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ یونان اقتصادی اور سماجی طور پر پاکستان سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کی فی کس آمدنی ۱۲۰۰ ڈالر سالانہ ہے، جبکہ پاکستان میں یہ صرف ۱۸۴۰ روپے ہے۔ یونان کو مغربی تہذیب کی ماں کہا جاتا ہے اور اس عوام کے سیاسی شعور کی سطح ہمارے ہاں سے کہیں بلند ہے۔ اس کے باوجود یونان کی سیاسی صورت حال ابتر ہے۔ فوجی کرنل جنھوں نے ۱۹۶۷ء میں حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرلیا تھا، یہی کہا تھا کہ وہ تضادات کو حل کرنے اور سیاسی استحکام کے لئے یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ مگر سات سال بعد یونان میں حالات پہلے سے بھی ابتر ہیں اور انھوں نے نہ صرف اپنے ملک کا حشر خراب کر دیا ہے بلکہ ساتھ میں قبرص کا بھی۔ ابھی ترکی سے جنگ چھڑتے چھڑتے بچی ہے۔ بالآخر یونانی قوم کو اپنے سیاسی رہنما کونستنتائن کرامانیلس کو آواز دینا پڑی جو یونان کو تباہی سے بچانے کے لئے پیرس سے وطن پہنچا۔

ارجنٹائن میں تقسیم کا مسئلہ سلجھانے کی بجائے سالوں تک سیاست سے فٹ بال کھیلنے کے بعد فوجی ٹولے کے رکن جنرل ہارگنڈ یگے کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ''چند سویلین معاونوں والے فوجی ٹولے سے کام نہیں چل سکتا۔'' جنرل ہارگنڈ یگے نے عوامی سویلین شراکت والی کھلی حکومت کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے۔ یہ الفاظ بیونس آئرلیس میں ادا کئے گئے ہیں، مگر اسلام آباد میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

تہذیب کا ایک اور مرکز اٹلی بھی ان دنوں گہرے اور شدید اقتصادی اور سیاسی بحران میں گرفتار ہے۔ وہاں تو اخبارات زیادہ ہی شدید ہیں۔ مروجہ نظام سے مایوس ہو کر اور موجودہ بحران کا کوئی نارمل علاج نہ پا کر ریڈ بریگیڈ والے اطالوی ریاست کے موجودہ ڈھانچے کو تباہ کر کے ایک نیا، غیر طبقاتی ڈھانچہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا تجزیہ یہ ہے کہ موجودہ ڈھانچے کو تباہ

کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ فوج کو اقتدار سنبھالنے پر مجبور کر دیا جائے۔ باقی کام فوج خود کرلے گی۔ ان کے خیال میں جب فوج اقتدار پر قابض ہو جائے گی تو آئین اور اس کے تحت بنائے گئے اداروں پر مشتمل اطالوی نظام برباد ہو جائے گا۔ اور جب ریاست کے ستون گرنے لگیں گے تو استحصالی ریاست کی عمارت بھی زمین بوس ہو جائے گی۔ ریڈ بریگیڈ والے حکومت پر فوج کے قبضے کو مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ جیسا حل پاکستان میں ہو رہا ہے۔ مگر اٹلی کے بڑے فوجی اس دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ وہ انتہائی تعلیم یافتہ اور اطالوی قوم پرستی کی تاریخ سے باخبر ہیں۔ انھیں یاد ہے کہ اطالوی قوم کو حتمی اور فیصلہ کن فوجی کامیابی کے ذریعے متحد کرنے کے بعد جیر یبالڈی نے اپنی بیوی اینا کے ساتھ پہاڑوں کا رُخ کیا تھا اور نئی اطالوی قوم کے اتحاد کو مستحکم کرنے کا کام کاؤنٹ کامیلوڈی کیور، پیڈمونٹ جیسے ماہر سیاست دان پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر سو سال قبل اٹلی کا استحکام ایک سیاسی ذمہ داری تھی تو آج۔ ۱۹۷۸ء میں بھی اٹلی کی مسلح افواج فوجی مداخلت کے ذریعے اطالوی ریاست کا تیا پانچہ کرنے کی ریڈ بریگیڈ کی دعوت قبول نہیں کریں گی۔

انقلاب روس کے بعد لینن نے فوج پر پارٹی کی سیاسی بالادستی کو مستحکم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی تھی۔ اسٹالن بھی اس بنیادی ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لینن اور اسٹالن دونوں کو علم تھا کہ اگر فوج پارٹی پر یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے سیاسی کنٹرول اور نظم و نسق پر غالب رہی تو سوویت ریاست مستقل خطرے میں گھری رہے گی۔ انقلاب کے دن سے لے کر آج تک سیاسی بالادستی یعنی پارٹی کی فوج پر بالادستی کا اصول سوویت ریاست کا مستقل اور بنیادی اصول رہا ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ اس کا مطلب ترقی اور مضبوطی ہے۔ جبکہ دوسرا راستہ تصادم اور افراتفری کا راستہ ہے ۱۹۵۷ء میں سوویت یونین کے وزیر دفاع فاتح برلن اور دوسری جنگ عظیم کے عظیم جرنیل، مارشل زوخوف کو محض 'بوناپارٹسٹ' (فوج پسند) رجحانات کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا تھا۔

عوامی جمہوریہ چین میں بھی انقلاب کے بعد سے یہی اصول رہا ہے۔ اور اسی میں

چین اور اس کے عوام کے لئے بہتری ہے اگر چین میں فوج پارٹی اور سیاسی قیادت پر غالب آ جاتی تو چین جنگی سرداروں کے دور کی طرف لوٹ جاتا۔ آخر چین کے ۸۰ کروڑ عوام کو مارشل لاء ضابطہ ۱۲ نے تو متحد نہیں رکھا ہوا۔ ان کی ترقی اور طاقت کا راز سرِ عام کوڑوں کی سزاؤں میں تو نہیں ہے؟ چین اور چین کے عوام اپنی سیاسی قیادت اور سیاسی جذبے کی بدولت ان بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ یہی سیاسی جذبہ چین کے اتحاد اور اس کے ۸۰ کروڑ عوام کی قربانیوں کا محرک ہے۔ جب چین کے وزیر دفاع مارشل لن پیاؤ نے چیئر مین کو قتل کرنے اور چین پر فوجی تسلط جمانے کے لئے اپنا 'آپریشن فیئر پلے' یعنی پراجیکٹ ۵۷۱ کا خاکہ تیار کیا تھا' تو وزیر اعظم چواین لائی نے براہِ راست فوج کی کمان سنبھال لی اور مارشل لن پیاؤ کی سازش کو ناکام بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وزیر اعظم چواین لائی کی بروقت کارروائی سیاسی قیادت اور پارٹی کی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے تھی اور اس نے چین کو تباہی سے بچالیا۔

ترکی کی مثال

ہمارے جرنیل ترکی کی بہت مثال دیتے ہیں' ترکی کی تاریخ سے کوئی واقفیت رکھے بغیر قسطنطنیہ کی فتح کے زمانے سے' (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) ترکی کی مسلح افواج نے کبھی شکست کا مزا نہیں چکھا۔ ترکی کی مسلح افواج اور اس کے فوجی رہنماؤں نے برطانوی سلطنت کے ظہور تک دنیا کی عظیم ترین سلطنت قائم کئے رکھی سلجوقیوں کے دور سے عثمانیوں کے زمانے تک' یہ صدیوں کی فوجی فتوحات کی شاندار داستان ہے۔ ان پے در پے فتوحات کے ساتھ ساتھ بعض ناکامیاں بھی ہیں۔ مگر کوئی ناکامی ایسی نہیں جو مسلح افواج یا اس کے رہنماؤں کے لئے شرمناک ہو۔ حالانکہ بعض جنگوں میں ساری کی ساری فوج ختم ہوگئی' ایک بھی فوجی نہ بچا۔ وی آنا میں جنرل مصطفیٰ کی شکست بھی کوئی فوجی شکست نہ تھی۔ اسی طرح گیلی پولی کی جنگ میں ترک فوجیں اس بے جگری سے لڑی تھیں کہ جنگ کا نتیجہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ڈارڈیلسن کے مقام پر برطانویوں کی مکمل شکست ایسی تھی کہ ونسٹن چرچل مرتے دم تک اسے بھلا نہ سکا۔

ترکی اگر یورپ کا مردِ بیمار بنا تو مغربی طاقتوں کی سفارتی سازشوں کی وجہ سے، مگر ایک کمزور اور فرسودہ سلطان کو ''اطاعت پسندی'' پر مجبور کرنے کے نتیجے میں محبِّ وطن قوتوں میں نفرت کا لاوا ابل پڑا اور نوجوان ترکوں کی تحریک نے جنم لیا۔ یہ بنیادی طور پر سیاسی اصلاحات کی تحریک تھی اور اس کی جڑیں ترکی کی تاریخی اور سیاسی روایات میں گہری تھیں۔ نوجوان ترک سپاہیوں اور سیاستدانوں پر مشتمل تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا، انور پاشا، عصمت پاشا، رؤف پاشا اور طلعت پاشا سپاہی بھی تھے اور سیاست دان بھی۔ کیونکہ ترکی گذشتہ پانچ صدیوں سے جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک محوری طاقت کی حیثیت سے ترکی نے پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کے ساتھ ساتھ شکست تسلیم کی۔ مگر مصطفےٰ کمال پاشا کی ولولہ انگیز رہنمائی میں ترکی نے اس شکست کو فتح میں بدل دیا۔ مصطفےٰ کمال کی دلیرانہ قیادت میں ترکی نے شکست خوردہ اور ٹکڑے ٹکڑے قوم کو متحد کیا اور فرانس و برطانیہ کے حلیف یونان کو شکستِ فاش دی۔ غیر ملکیوں کو ترکی کی سرزمین سے نکالنے کے بعد اس عظیم سپاہی قوم کے سپاہی رہنما نے فوجی وردی اتار پھینکی۔ اس نے ترکی کو ایک آئین دیا اور ایک پارلیمنٹ دی۔ ترکی کو ایک جدید ملک بنایا اور عورتوں کو آزادی دلوائی۔ اتاترک نے پہلے ایک پارٹی کی ریاست کی تشکیل دی اور اس زمانے میں ملی جلی معیشت کا نظام اختیار کیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے ملکی میں جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لئے اپوزیشن پارٹی کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ انونو کے ہیرو عصمت پاشا کو فوجی ذمہ داریاں چھوڑ کر مکمل طور پر سیاست میں آنے پر آمادہ کیا۔ اور اسے وزیراعظم اور پیپلز ری پبلکن پارٹی کا سربراہ بنا دیا۔ انھوں نے ماہر اقتصادیات اور بینکر جلال بایار کو ڈیموکریٹک پارٹی کا صدر بنانے کی حوصلہ افزائی اور حمایت کی۔ یہ درست ہے کہ تاریخی وجوہات، قابل فخر اسباب اور شاندار کامیابیوں کی وجہ سے ترکی کے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں فوجی روایات گھلی ملی رہی ہیں۔ مگر اگر اتاترک زندہ رہتے یا ان کی صحت اجازت دیتی تو وہ ترکی کی سیاست سے فوجی اثرات کو مکمل طور پر ختم کر کے دم لیتے۔

جب اتاترک کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنے پیچھے ایک جمہوری ترکیہ کا نوعمر بچہ چھوڑا۔ جمہوریت کے اس نازک پودے نے بہت سرد گرم دیکھا ہے۔ دس سالہ دورِ اقتدار کے

بعد ۱۹۵۰ء میں ری پبلکن پارٹی کو ڈیموکریٹک پارٹی کے ہاتھوں شکست ہوئی اور جلال بایار صدر اور عدنان میندریس وزیراعظم بنے۔ اور پھر مئی ۱۹۶۰ء میں فوجی جرنیلوں نے نقب لگائی اور فوجی انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ترکی خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا تھا اور وہ مداخلت پر مجبور ہو گئے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں کو یسیدا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا اور رسوائے زمانہ 'یسیدا مقدمات' کا سلسلہ شروع ہوا۔ وزیراعظم میندریس' وزیر خارجہ زورلو اور وزیر خزانہ کرپیتکن کو سزائے موت دی گئی۔

اس المناک اعلان کے فوراً بعد صدر ایوب خان نے مجھے اپنے خصوصی نمائندے کے طور پر انقرہ بھیجا۔ تاکہ اس فیصلے پر عمل درآمد نہ کرنے کی اپیل کروں۔ میں انقرہ میں صدر جنرل گرسل سے ملا۔ وزیر خارجہ سلیم ساپر بھی موجود تھے اور انھوں نے ترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ گفتگو بڑی جاندار تھی۔ جنرل گرسل نے مجھے بتایا کہ سزائے موت پر عمل درآمد سے ترکی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں نے احترام کو ملحوظ رکھ کر مگر سختی کے ساتھ انھیں ٹوکا۔ ''جناب صدر' مسائل تو سزاؤں کے بعد شروع ہوں گے۔''

جب میں ایوان صدر سے رخصت ہوا تو سلیم ساپر میرے ساتھ تھے۔ ''خدا رحم کرے'' یہ ان کا الوداعی جملہ تھا۔

آج ترکی جس شدید اور پریشان کن تقسیم سے دوچار ہے' اس کی جڑیں پھانسیوں کے اسی ناعاقبت اندیشانہ فیصلے میں ہیں۔ ترکی کی مسلح افواج جان چکی ہیں کہ تضادات کا عمل سیاسی نوعیت کا ہے اور سیاسی ارتقاء ہی سے کسی توازن یا سمجھوتے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ سیاست کے میدان کے باہر سے کسی براہِ راست یا گھٹیا مداخلت کے ذریعے حالات مزید بگڑیں گے۔

ہر ملک میں سیاسی افراتفری اور اضطراب کے لمحے آتے ہیں۔ برطانیہ میں ٹریڈ یونینوں کو متوازی حکومت کہا جاتا ہے۔ مگر ان سے نمٹنے کے لئے کبھی فوج کی مداخلت کا سوچا بھی نہیں۔ نہ ہی برطانوی فوج نے ۱۹۳۱ء کی عام ہڑتال کے دوران عنانِ حکومت سنبھالی' جب پورا ملک مفلوج ہو گیا تھا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کے 'عظیم بحران' کے زمانے میں امریکی نظام تقریباً منہدم ہو

گیا تھا۔ مگر امریکہ کی مسلح افواج نے سیاسی اقتدار پر قبضہ نہیں کیا۔ اگر فوجی مداخلت کے لئے پاکستانی فوجی بغاوتوں والا جواز استعمال کیا جائے تو ساری دنیا پر جرنیل راج کا تسلط ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اٹلی کی فوج کے چیف آف اسٹاف روم ٹیلی ویژن پر نمودار ہوتے اور بائبل سے ایک اقتباس پڑھنے کے بعد عوام کو مطلع کرتے کہ وہ مداخلت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تو ان کے الفاظ میں زیادہ وزن ہوتا۔ مگر اٹلی میں ایسا نہیں ہوا۔ اور نہ ہو گا کیونکہ اس کا مطلب اٹلی اور اس کے اتحاد کا خاتمہ ہو گا۔

فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کسی اشتعال، حوصلہ افزائی یا بحران کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب بھی ایسا ہوا ہے، بحران حل ہونے کی بجائے شدید تر ہی ہوئے ہیں۔ بحران نئے سرے سے اور نئی طاقت کے ساتھ لوٹ کر آتے ہیں۔ اگر یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو راولپنڈی پریس کانفرنس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا یہ دعویٰ درست ہے کہ 'سیاسی مسائل سیاسی طریقوں ہی سے حل کئے جا سکتے ہیں'، تو انھیں یہ بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ ''سیاسی مسائل سیاست دان ہی حل کیا کرتے ہیں۔''

جنگِ عظیم اول کے خاتمے پر وزیراعظم فرانس کلیمینکو نے ایک گہری بات کہی تھی۔ پاکستان کے جرنیلوں کو اسے یاد رکھنا چاہیے جناب کلیمینکو نے کہا تھا:

''جنگ کوئی کھیل نہیں کہ اسے جرنیلوں پر چھوڑ دیا جائے۔''

جب معاملہ امن کا ہو، تو اس زریں قول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باوجود کشمکش سے بھرپور طویل دن کی شام پڑتے پڑتے میں صورتحال پر قابو پا چکا تھا۔ اب تو اپوزیشن بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ حفاظتی حراست سے رہائی کے بعد پی این اے کے رہنما نوابزادہ نصراللہ خان نے اعتراف کیا کہ ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو معاہدہ طے پا چکا تھا کیونکہ رات ساڑھے دس بجے تک میں

اپنے اعتراضات واپس لے چکا تھا اور معاہدے پر اگلے روز دستخط ہونے والے تھے، مگر وہ روز جو منحوس ثابت ہوا۔

وائٹ پیپر کے صفحہ ۱۳۹ پر راؤ رشید کے ۲۹ مئی ۱۹۷۷ء کے نوٹ کا حوالہ دیا گیا ہے:

''امن وامان کی صورت حال مسلسل بہتر ہو رہی ہے۔ اگرچہ پی این اے ایک بار پھر امن عامہ کا بحران پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ صلاحیت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ مذاکرات کو جتنا طول دیا جائے، بہتر ہے۔ دوبارہ انتخابات ہر لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔''

اس ''ہر لحاظ سے'' میں قومی مفادات کا لحاظ سب سے مقدم ہے۔ ۵-۴ جولائی کی درمیانی رات کو قریباً ایک بج کر بیس منٹ پر جب سازشی کارروائی شروع کر چکے تھے تو حفیظ پیرزادہ خوش خبری لے کر آیا۔

''سر، مبارک ہو۔ بحران ختم ہو چکا ہے۔''

میں نے پوچھا کہ وہ کیسے، تو اس نے کہا کہ 'اپوزیشن کا ابال ختم ہو چکا ہے' میں ہنس پڑا اور ممتاز علی بھٹو سے کہا کہ وہ پیرزادہ کی اس سدابہار خوش فہمی کا ابال ختم کرے۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے پیرزادہ کو شدید سیلاب کے زمانے میں سکھر بیراج لے جانا پڑے گا۔ ہم سب ہنستے رہے۔

تیس منٹ کے اندر اندر ہم نے دوسرا قہقہہ سن لیا۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آخری قہقہہ کس کا گونجے گا!۔

15......

عظیم ترین آ درش

پاکستان کا مستقبل

جنرل ضیاء کو چاہیے کہ وہ ان مقامات پر پرواز کرنے میں جلدی نہ کریں' جہاں فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں۔ اب چونکہ اس کی پے در پے حماقتوں کا عدالتی نوٹس لیا جا سکتا ہے' ضروری ہے کہ اسے مزید حماقتوں سے روکا جائے۔ سیاست کی الف ب سے بھی ناواقف۔ اس اناڑی شخص کے مسخرے پن سے افغانستان کے معاملے میں اور سرحد' بلوچستان کے مسائل کے سلسلے میں میری سب کامیابیوں پر پانی پھر گیا ہے۔ پاکستان کو ان حماقتوں کی بہت مہنگی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ جنرل اور اس کے منہ چڑھے مشیروں کے گھٹیا حربوں اور ''خفیہ شق'' کے واویلے سے مسئلہ کشمیر پر موَقف کو پہلے ہی شدید نقصان پہنچ چکا ہے۔ ان حرکتوں کا گھناؤنا مقصد بھی یہی تھا۔

میں نے صرف ۹۰،۰۰۰ جنگی قیدیوں اور ۵۰۰۰ مربع میل کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا' بلکہ انھیں حاصل بھی کیا تھا۔ میرا بدترین دشمن بھی اس کارنامے سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں' میں نے مجیب الرحمٰن کے جنگی مقدمہ چلانے کے منصوبے کو بھی روکا۔ میں نے جموں کشمیر

کے عوام کے حق خود اختیاری پر مضبوط مؤقف اختیار کئے رکھا میں نے شہنشاہ ایران کو بھارت کو راجستھان نہر کی دفاعی تنصیبات کی تعمیر کے لئے قرضہ دینے سے بھی روکے رکھا۔ جی ایچ کیو کے اعتراضات پر میں نے سلال ڈیم کا معاہدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اس جنرل کو فرانس کے صدر سے لیموں تو مل گیا ہے' اب جب وہ بھارت جائے گا تو بھارتی وزیراعظم سے اسے چیکو بھی مل جائے گا۔

وقت ہے کہ جنرل اپنے گریبان میں جھانکے اور بحرانوں کے دلدل میں پھنسے پاکستان پر رحم کرے۔

میں واضح کردوں اور اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ خودغرضی' نااہلی اور ذاتی انتقام ایک ہولناک بحران کے نقطے پر مل چکے ہیں۔ اور آج پاکستان کو اپنی تاریخ کے شدید ترین خطرے کا سامنا ہے۔ ایسا بحران جس کے سامنے ۱۹۷۱ء کا بحران حقیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طاقت کی سیاست کے اس دور میں ہمارے پانچوں ہمسایہ ممالک اس بحران میں براہِ راست ملوث ہیں۔ اگر گڑبڑ اور عدم استحکام سے پاکستان کا مستقبل متاثر ہوتا ہے تو یہ سمجھنا خطرناک اور احمقانہ ہوگا کہ یہ ہمسایہ ملک اس طوفان سے بچے رہیں گے۔ یہ سوچنا خوش فہمی کی انتہا ہوگی کہ یہ پانچوں ملک صوفی اور سنت بن جائیں گے اور اپنا منہ دوسری طرف کرلیں گے۔ باقی ماندہ پاکستان سے ان میں سے ہر ایک کے براہِ راست حربی۔ ارضی اور سیاسی مفادات وابستہ ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی صورتحال کو نظرانداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے ہمارا محبوب وطن ایک ایسا میدانِ جنگ بننے والا ہے جو ویتنام سے زیادہ خوفناک اور تباہ کن ہوگا۔

جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد بابر کی عظیم سلطنت انتشار کا شکار ہوئی تو غیرملکی حملہ آور قیصرِ روم جیسی امیر سلطنت کی لوٹ کے مال میں حصہ لینے کے لئے جھپٹ پڑے تھے سابق گورنروں' محروم سرداروں اور قسمت آزمانے والے فوجیوں نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کرلیں۔ اور سلطنت کی بوٹیاں ہوگئیں۔

اگر چنگیز خان کی آل اولاد پر ایسا برا وقت آ سکتا ہے تو ان سے چھوٹے کمتر انسانوں کے لئے تاریخ خود کو بڑے آرام سے دہرا سکتی ہے۔ مردہ یا زندہ گھوڑوں پر مکروہ مباحثے بے معنی ہیں۔ خطرہ سر پر ہے اور وقت کا تقاضا یہی ہے کہ مزید شکست و ریخت کو کسی نہ کسی طرح روکا جائے۔ زبان درازیاں' گالم گلوچ اور تشدد کا نتیجہ اور بھی بھیانک ہوگا۔

اس کے لئے مارشل لاء کے منحوس اور مکروہ وجود کا خاتمہ کیا جانا لازمی ہے۔ چمچی کے ذریعے اقتدار کی چوری کرنے سے اور دھواں نکلے گا۔ ادھر قابلِ رحم اور کوتاہ نظر جنگ باز ایک بلوچ سیاست دان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو کہ بے چارہ سردار بھی نہیں۔

مگر مجھے اس کی آواز سے زیادہ اس کے پیچھے بولنے والی آوازوں پہ تشویش ہے۔ میرا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی شخص دوسری طاقتوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ سرحدوں کے پار پائے جانے والے نظریات اور خیالات سرحدوں کے اندر پائے جانے والے نظریات اور خیالات سے مشابہہ ہوں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ نظریات کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور اسی لئے جدوجہد زیادہ سنگین اور شدید ہو جاتی ہے۔ جون ۱۹۷۷ء میں میں نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں کہا تھا کہ اگر پاکستان غیر مستحکم ہوا تو افقی اور عمودی تضادات شدت اختیار کر لیں گے۔ افقی تضادات سے میری مراد صوبائی تضادات تھے اور عمودی تضادات سے مطلب طبقاتی تضادات۔ اور یہی ہوا۔

مجیب الرحمن نے بھی اپنے منصوبے کا اعلان لاہور ہی میں کیا تھا۔ مگر اگر وہ دو بیرونی طاقتوں کے پروں پر پرواز نہ کر رہا ہوتا تو اسے محض اس اعلان کے لئے ڈھاکہ سے لاہور آنے کی ضرورت نہ تھی۔ مجیب الرحمن گرفتار ہوا' اور ڈھاکہ میں پی این اے کے جوڑی داروں نے حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ مگر ڈھاکہ پھر بھی نہ بچ سکا۔ اب ۷۱-۱۹۷۰ء کی کہانی عین مین دہرائی جا رہی ہے۔

رجعت پسند اسی قسم کے عوام دشمن گٹھ جوڑ میں مصروف ہیں وہی گھٹیا لوگ' وہی منصوبہ بندیاں' وہی جوڑ توڑ ...... حیران کن حد تک یہ سکیم پہلے والی سکیم سے مشابہت رکھتی ہے۔ فرق یہ

ہے کہ اس بار یہ پہلے سے زیادہ ہلاکت خیز ہے۔صرف عقلمند ہی ماضی کے تجربے اور غلطیوں سے سیکھتے ہیں۔

لندن پلان کے دو حصے تھے۔ میں نے دوسرے حصے پر عمل درآمد کو ناکام بنادیا تھا اور یہ دفن ہو چکا تھا۔مگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب نے مردے کو پھر زندہ کر دیا ہے اور یہ اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ بھوتوں کا تعاقب کرنا وقت اور توانائی کا ضیاع ہے۔ معالج کو چاہیے کہ پہلے اپنے زخموں کا علاج کرے۔۱۹۷۳ء کے آئین کو اصل شکل میں بحال کرنا عظیم حب الوطنی کا شاہکار ہوگا۔

ایک فراخ دلانہ اور شاندار اتفاق رائے کے لئے ضروری ہے کہ مستند اور مقبول رہنماؤں سے مذاکرات کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر اس شکستہ اور محصور ملک کو، جس کے حصول کی خاطر لاکھوں انسانوں نے خون کا غسل کیا تھا، بچایا جا سکتا ہے۔

آخر میں میں جواہر لال نہرو کی ''ہندوستان کی دریافت'' سے ایک اقتباس دینا چاہتا ہوں۔ یہ آخری کتاب تھی جو انھوں نے ایک جمہوری اور آزاد ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالنے سے پہلے جیل میں لکھی۔ یہ اقتباس آستروفسکی کی ''لوہا فولاد کیسے بنا'' سے لیا گیا ہے۔

> ''انسان کی عزیز ترین متاع زندگی ہے اور چونکہ یہ اسے صرف ایک مرتبہ ملتی ہے، اس لئے اسے ایسے گذارنا چاہیے کہ ایک بزدلانہ اور حقیر ماضی کی یاد سے شرمسار نہ ہو۔ ایسے کہ بےمقصدیت کے ان گنت سالوں کا جبر نہ سہنا پڑے۔ اور مرتے وقت وہ کہہ سکے۔'میری تمام زندگی اور میری تمام طاقت دنیا کے عظیم ترین آدرش کے لئے وقف تھی۔نوع انسان کی آزادی کا آدرش۔''

ضمیمہ (الف)

آخری خطاب

سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کے دوران جناب ذوالفقار علی بھٹو کے بیان کا مکمل متن

مجھے خوشی ہے کہ آج اپنے آپ کو دوبارہ لوگوں کے درمیان موجود پا رہا ہوں میں یہاں جسمانی اذیتوں کا کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی پھانسی کی چھوٹی سی کوٹھڑی سے اپنے عوام اور پاکستان کا جو مستقبل دیکھ رہا ہوں اس کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں مجھے عوامل کا احساس ہے جو مقدمہ کو جلد ختم کرنے کے طالب ہیں۔ ایک اخبار کی رپورٹ کے برعکس میں کسی بھی ادارے کو اسکینڈلائز نہیں کرنا چاہتا۔ ادارہ ہی کون سا رہ گیا ہے جس کو اسکینڈلائز کیا جا سکے۔ ان اداروں کے ساتھ میرا انتہائی قریبی تعلق رہا ہے اور ان کو تسلیم کرانے میں میں نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے میں کیسے ان اداروں کو تباہ کر سکتا ہوں۔ ۱۹۷۳ء کا آئین ایک متفقہ آئین تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ محمد علی اور ایوب خان کے بنائے ہوئے آئین کی طرح کل کوئی یہ کہے کہ

۱۹۷۳ء کا آئین ذوالفقار علی بھٹو کا آئین تھا میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ یہ آئین میں نے بنایا ہے بلکہ میں نے اس آئین کو بنانے کے لئے کام کیا ہے۔ میرے دل میں عدالت کا مکمل احترام ہے جناب چیف جسٹس آپ کو یاد ہوگا کہ جب حمود الرحمان کمیشن جس کے موجودہ چیف جسٹس بھی ممبر تھے نے میرا بیان قلم بند کرنے کے لئے ایوان صدر آنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اپنے اسپیشل اسسٹنٹ کے ذریعے اس وقت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس حمود الرحمان کو یہ پیغام دیا کہ میں خود کمیشن کے روبرو حاضر ہوں گا نہ کہ کمیشن میرے پاس ایوان صدر آئے اس طرح اکتوبر ۱۹۷۷ء میں بیگم نصرت بھٹو کیس میں جب فاضل عدالت ٹوکتی تھی تو میں فوراً خاموش ہو جاتا تھا۔ اس وقت میں کوٹ لکھپت جیل میں تھا۔ اس وقت کے سماجی حالات کے مطابق میں نے نکات پر اصرار کیا تھا کہ فاضل عدالت الیکشن کے ضمن میں وقت کا تعین کرے اور آئین میں ترمیم کی بالکل اجازت نہ دی جائے بلکہ اس کے لیے طریقِ کار اور وقت کا تعین کر دیا جائے اور آپ نے اپنے فیصلہ میں آئین میں ترمیم کے اختیار کو نظریۂ ضرورت کے تحت محدود کیا تھا لیکن موجودہ حکمرانوں کے لئے آپ کا وہ فیصلہ ان کے شعور سے بالا تھا۔ اور بجائے آپ کے فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کے وہ امورِ مملکت ان دلائل کی بنیاد پر چلا رہے ہیں۔ جو ان کے وکلاء نے مارشل لاء کی حمایت میں بیگم نصرت بھٹو کیس میں دیئے تھے۔

جناب بھٹو نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ انہوں نے اس وقت آئینی مسائل پر اپنے موقف کی زیادہ وضاحت نہیں کی انہوں نے یاد دلایا کہ انہوں نے اس وقت اپنے ڈیڑھ گھنٹہ کے بیان میں ان نکات کی نشاندہی کی تھی کہ علاقائیت بڑھے گی پارٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور قومیتوں کا مسئلہ سر اٹھائے گا آج پاکستان ایک فیڈریشن میں نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تمام عمل سے قومی مفادات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پارٹیاں قوم کے لئے رابطہ کا سبب بنتی ہیں۔ اندرا گاندھی جو اتر پردیش سے تعلق رکھتی ہیں وہ جنوبی صوبے کرناٹک سے ستر ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوگئیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کی پارٹی قومی پارٹی ہے اس وقت اگر الیکشن کے لئے کوئی وقت مقرر کر دیا جاتا تو آج جو الارم بج رہے ہیں وہ اس صورت سے نہ

بچتے اب سوال یہ ہوگا کہ آئندہ منتخب ہونے والی اسمبلی مقننہ ہوگی یا آئین ساز قومیتوں کا مسئلہ اگر
شباب پر نہیں آیا تو پھوٹ ضرور پڑا ہے اس لئے اگر اس وقت الیکشن کے وقت کا تعین ہو جاتا تو
آج یہ حالات پیدا نہیں ہوتے انہوں نے کہا کہ ان کا کسی شخص کو بھی اسکینڈ لائز کرنے کا ارادہ
نہیں ہے۔ وہ عدالت میں اس کے لئے آئے بلکہ ۴۰۹ صفحات پر پہلے ہائی کورٹ کے فیصلے میں
کہی گئی باتوں پر اظہار خیال کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے عدالت میں آئے ہیں فیصلے میں انہیں
نام کا مسلمان کہا گیا ہے کسی شخص کو چاہے اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی
کے منفی ہونے پر رائے زنی کرے جسٹس صفدر شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کو یہ کہا
جائے کہ آپ پختون ہیں تو شاید برانہ مانیں مذہب اعتقاد کا مسئلہ ہوتا ہے اسے برداشت نہیں کیا
جا سکتا یہ ہمارا دین ہے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ سے یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ میرا مزاج میرا
کردار اور بے عزتی برداشت کرنے کی ہمت کتنی ہے۔ لاہور ہائی کورٹ میں ان کی بلا جواز بے
عزتی کی گئی۔ سرکاری وکیل نے مقدمہ کی کارروائی کے اختتام پر اپنے دورِ طالب علمی کا ایک
واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ ان کے ایک انگریز پروفیسر نے اپنے ساتھی سے لڑتے ہوئے دیکھ کر
پوچھا تھا کہ کیا بات ہوئی ہے تو وکیل سرکار نے جواب دیا تھا کہ ان کے طالب علم ساتھی نے ان
کی بے عزتی کی تھی۔ اس پر پروفیسر نے جواباً کہا کہ شرفاء کی بے عزتی نہیں ہوتی انگریز پروفیسر کا
یہ جملہ نوآبادیاتی ذہن کی عکاسی کرتا تھا۔ یہ جملہ اسی طرح کا ہے جس طرح انگریز فوجی افسر میس
میں اپنے دیسی ماتحتوں کی بے عزتی کو "غیر محتاط گفتگو" کا نام دیا کرتے تھے اس کے برعکس جناب
بھٹو نے اپنے دورِ طالب علمی کا ایک واقعہ سنایا جب وہ امریکہ سے فارغ التحصیل ہو کر برطانیہ
کے ایک لاء کالج میں قانون کے دو سالہ کورس میں داخلہ لینے کے لئے ایک انگریز پروفیسر کے
پاس گئے تو اس نے مجھے کہا کہ چونکہ اس کورس کے لئے لاطینی زبان کا اچھی طرح علم ہونا ضروری
ہے اس لئے تم تین سال میں یہ کورس مکمل کرنے کی درخواست دو۔ وہ اس پر راضی ہو گئے لیکن
جب انگریز پروفیسر نے ان سے جاتے وقت یہ کہا کہ ہمارے بہترین دماغ بھی اس کورس کو سال
میں نہیں کر سکتے تو میں نے پلٹ کر فوراً کہا کہ میں اب یہ کورس دو سال ہی میں مکمل کرنے کی

درخواست کرتا ہوں کیونکہ پروفیسر کے اس جملہ میں مجھے نوآبادیاتی ذہن کو بو آئی تھی اور اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایشیائی باشندوں کو کمزور دماغ کے حامل سمجھتا تھا میں نے وہ کورس دو سال میں اعلیٰ درجہ میں پاس کر کے دکھایا۔

میں ایک روشن دماغ اور باشعور شخص ہوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں میں نے کسی کی بے عزتی نہیں کی اس لئے اسٹیٹ کونسل کو میری بے عزتی نہیں کرنی چاہیے جو آج بھی جاری ہے میرے دورِ حکومت کے سماجی حالات کو میرے خلاف الزام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ میرے خلاف جہاں بھی کسی قسم کی کوئی شہادت نہ مل سکی تو کہا گیا کہ یہ احکام ٹیلیفون پر دیئے گئے تھے۔ اس طرح ٹیلیفون میرے خلاف سب سے بڑا استغاثہ بن گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ لوگ مجھ سے دہشت زدہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی میرے خلاف قومی اسمبلی میں ہر قسم کی تقاریر ہوتی تھیں جیسا کہ راؤ رشید نے اپنے بیان حلفی میں کہا ہے کہ سول دورِ حکومت کے بدترین حالات کا موازنہ مارشل لاء کے دور حکومت سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ حالات جن کی بناء پر عبدالحیٔ نیازی ایس ایچ او چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگے میری نہیں بلکہ صدیوں کی پیداوار ہیں۔ لاہور میں ایف آئی آر میں میرا نام واقعے کے تین گھنٹے کے اندر درج ہو گیا تھا جب کہ یہ کہا گیا کہ پولیس والے میرا نام درج کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے انہوں نے استفسار کیا کہ اگر آج کوئی شخص پولیس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرائے تو کیا پولیس والے کا پس و پیش کرنا غیر فطری ہو گا۔ کیونکہ پولیس والا یہ خیال کر کے یہ رپورٹ درج کرانے والے شخص کو شاید وقت کا علم نہیں پس و پیش کر سکتا ہے استغاثہ سماجی حالات کو بیک وقت اپنی حمایت اور میرے خلاف استعمال نہیں کر سکتا میں سازش یا وقوعہ کے بعد کے وقت ماتحت عدالتوں میں مقدمہ کی سماعت اور فیصلے پر اظہار خیال کروں گا کہا گیا ہے کہ چونکہ احمد رضا قصوری میرے خلاف سخت تنقید کیا کرتا تھا اس لئے میں نے اسے ختم کرنے کی سازش کی ہے سیاست دان ہوں۔ رضا قصوری کوئی شخص نہیں جس نے مجھ پر تنقید کی بلکہ دوسروں نے اس سے کہیں زیادہ سخت الفاظ میں، لیکن بلکہ اس مفروضہ محرک کو میرے خلاف مجھ پر تنقید کی

دو دھاری تلوار کی طرح استعمال کیا گیا اگر یہ تنقید صحیح مان لی جائے تو اس سے برافروختہ ہو کر میں اسے ختم کرنا چاہتا تھا میں نے سیاسی خاندان میں آنکھ کھولی اور بائیس سال سے سیاست کے میدان میں ہوں یہ کہا گیا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں لیکن صرف وہی شخص الیکشن میں کامیاب ہوتا ہے جس سے لوگ محبت کرتے ہیں اگر میں ایسا ہوتا تو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پانچ مختلف مقامات سے کامیاب نہ ہوتا۔ میں پہلی بار اسمبلی میں نہیں آیا۔ میں بلا مقابلہ منتخب ہوا ہوں میرے والد اور میرے چچا سندھ کے نمائندے رہے ہیں۔ ہمارا خاندان برسوں سے اسمبلیوں میں رہا ہے عوامی نمائندہ اور سیاست دان ہونے کی بناء پر مجھ پر تنقید ہوئی۔ اور میں نے اسے برداشت کیا۔ مفتی محمود کا یہ دعویٰ ہے کہ میں ان کے مقابلہ میں ڈیرہ اسماعیل خان سے ہار گیا تھا یہ تین تحصیلوں کا حلقہ تھا جس میں مجھے صرف ٹانک تحصیل میں دھاندلی کے ذریعے شکست دی گئی تھی۔ میں سیاست کرنا جانتا ہوں یہ کہا کہ میں ہٹلر تھا۔ میں ڈکٹیٹر تھا میں ظالم تھا آج ایک شخص اپنے آپ کو کہتا ہے کہ ہٹلر نے کبھی خود کو ایسا نہیں کہا تھا کہ میں دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہوں بلکہ وہ اپنے آپ کو نیشنل سوشلسٹ کہتا تھا دفعہ ۱۰ کا اطلاق پرانی دشمنی پر ہوتا ہے آپ داغدار دامن کے ساتھ دفعہ ۱۰ کا اطلاق کر سکتے ہیں مساوات اسی طرح ہو سکتی ہے۔ جب اپنا دامن صاف ہو صدر کارٹر کو گیانا میں جیمز ٹاؤن کے سانحہ کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے کیونکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو جیمز ٹاؤن کے مشکوک حالات کا علم تھا لیکن اس کے باوجود کانگریس نے ریان کو وہاں تحقیقات کے لئے جانے دیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا سازش میں دباؤ سے پہلے سازش کے مدعا کو ثابت کرنا ضروری ہے ایف آئی آر میں ان کو براہ راست ملوث نہیں کیا گیا بلکہ یاد رہے کہ الفاظ کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے جناب بھٹو نے اپنی تذلیل کا ذکر کیا اور جذبات سے مغلوب ہو کر ان کی آواز بھرا گئی انہوں نے کہا کہ میں ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا جس سے عوام شرمندگی محسوس کریں اس موقع پر عدالت میں سناٹا چھا گیا میں ایسا شخص نہیں ہوں جس کی جڑیں عوام میں نہ ہوں سادات ابھی تک اپنے کھوئے ہوئے صحرا کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہندو ابھی تک ہمارے علاقے کو بھارت ماتا کہتے ہیں میں نوے ہزار قیدی چھڑوا کر لایا ہوں۔ میں

مجرم نہیں ہوں میں نے نوے دن تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی ۔ ۱۵ اکتوبر کو جیل سے جب دو قیدی فرار ہوئے تو دس دن تک مجھے کمرہ سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔ میں ملک سے فرار نہیں ہونا چاہتا۔ مصطفیٰ کھر نے مجھے میری نظر بندی کے دوران کہا تھا کہ یہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں آپ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں ملک نہیں چھوڑوں گا اگر وہ جانا چاہتے ہوں تو چلے جائیں ستمبر میں اسی طرح ایک غیر ملکی نامہ نگار نے نواب صادق قریشی کی رہائش گاہ پر پریس کانفرنس میں مجھ سے کہا کہ میں آپ کا مداح ہوں آپ لاڑکانہ نہ جائیں بلکہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں میں نے اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا میں اسے نہیں بھولوں گا لیکن میں اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جاؤں گا اور لاڑکانہ ضرور جاؤں گا یہ دھرتی میرا وطن ہے میں جس میں پیدا ہوا۔ میں رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ بلکہ میں انصاف کا طالب ہوں موت برحق ہے ہر شخص کو مرنا ہے مجھ پر سانگھڑ میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ صادق آباد میں ہوا۔ قبائلی علاقہ میں میرے دورے کے موقع پر بم پھٹا لیکن میں نے اس موقع پر تقریر کی اور بلوچستان کے دورے کے دوران ایک شخص نے مجھے ''پنجابی پھو یہ لو'' کہہ کر مجھ پر گرنیڈ پھینکا خان آف قلات نے جو میرے بہت دوست تھے ہاتھ پکڑ لئے کہ میں وہاں نہ جاؤں لیکن میں بہادر بلوچوں کے ہر علاقے میں گیا۔

میرے خلاف یہ مقدمہ من گھڑت اور جھوٹا ہے انصاف غیر منقسم ہوتا ہے میں اپنی معصومیت کو باور کرانا چاہتا ہوں میرے ساتھ بدترین ناانصافی ہوئی ہے میں انتہائی اشتعال انگیزیوں کے باوجود انتہائی شائستہ اور مودبانہ انداز میں ہائی کورٹ کو مخاطب کر کے اپنی معروضات پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہیں دیا گیا اور اس کے باوجود فیصلے میں مجھے عادی جھوٹا کہا گیا اس الزام کے حق میں نام کا مسلمان ہوں کیا شہادت ہے لاہور ہائی کورٹ کی پوری تاریخ میں شاید دوسرا کٹہرا بنوایا گیا تھا جس میں میرے لئے کرسی رکھی گئی تھی اور چیف جسٹس نے کہا تھا کہ یہ آپ کے آرام کے لئے ہے کیونکہ آپ نے بہتر زندگی دیکھی ہے لیکن میں نے اپنی بہتر زندگی کے لئے کوئی جائیداد غبن نہیں کی ۲۸ نومبر کو سی ایم ایل اے نے اپنی ایک تقریر میں

کہا ہے کہ ہٹلر کے جرمن جرنیلوں کے ساتھ نیورمبرگ کے مقدمہ میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نیورمبرگ کے مقدمات پر آج بھی تنقید ہو رہی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نیورمبرگ میں فاتح افواج نے مقدمے چلائے تھے اور وہاں بھی ان کے لئے کوئی کٹہرا نہیں بنایا گیا تھا اور ملزم جرنیلوں کے ساتھ نہایت تکریم اور احترام کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ آج بڑی طاقتیں اپنے آپ کو مشرق وسطیٰ پر حملہ کے لئے تیار کر رہی ہیں اور تیسری عالمی جنگ یہیں سے شروع ہوگی باقی علاقوں میں یہ طاقتیں اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے تیار کر رہی ہیں لاہور ہائی کورٹ کے رویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ایک بار اپنی بیٹی سے ملنے کی درخواست کی کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے بیٹے مجھے شاید مایوس کر سکتے ہیں لیکن مجھے اپنی بیٹی سے مایوسی نہیں ہوگی اس کے جواب میں مجھے یہ بتایا گیا کہ ہم مجبور ہیں اور کہا گیا کہ مارشل لاء کے ضابطہ ۱۲ کے تحت نظر بند ہوں چیف جسٹس میرے خلاف شکایات کنندہ بن گئے اور انھوں نے ایس پی سرفراز اللہ کو میرے خلاف رپورٹ درج کرانے کا حکم دیا اور ایک وکیل آفتاب گل سے کہا کہ ''بھائی یہ باتیں تم نے بھی سنی ہیں'' میرا اعتماد اس وقت مجروح ہو گیا تھا جب چیف جسٹس نے مجھ سے کہا تھا کہ سندھ میرا صوبہ نہیں تمہارا صوبہ ہے۔ آج پاکستان میں گھمبیر بحران آرہا ہے اس کی کوئی سمت نہیں ہے ایک سال پہلے میں نے کوٹ لکھپت جیل میں کہا تھا کہ بھارتی وزیر خارجہ پاکستان کے خلاف بات کرے گا۔ آج یہ درست ثابت ہو گیا ہے جب سادات یروشلم جارہا تھا تو میں نے کہا تھا یہ فیصلہ ہوگا اور وہی ہوا میں پاکستان کے مستقبل کو درپیش مسائل کے بارے میں تفصیل سے بات کرنا چاہتا ہوں جس پر چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوارالحق نے کہا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ خارجہ پالیسی پر آپ جیسے ماہر کا خیال سنا جائے لیکن جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں اس کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔

لاہور ہائی کورٹ نے مقدمہ قتل میں مجھے جو نام کا مسلمان کہا ہے۔ وہ میری نہیں بلکہ عوام کی بے عزتی اور ہتک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ عوام کو کہہ رہے ہیں کہ وہ اچھے مسلمان نہیں ہیں۔ یہ الزام بے عزتی ہے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوام نے مجھے بھاری اکثریت سے

کامیاب بنایا تھا۔ اس قسم کے الزامات مجھ پر عائد کرنا انتہائی تکلیف دہ ہے، میں ان الزامات کے بجائے پھانسی پر چڑھنے اور سولی پر لٹکنے کو ترجیح دوں گا۔

قائداعظم نے ایک اسلامی ملک حاصل کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم بننے سے انکار کر دیا تھا اور اب ایک اسلامی ملک میں کہا جا رہا ہے کہ فلاں شخص مسلمان نہیں ہم اس خیال کو نہیں مانتے اور ہماری پارٹی اس خیال کے خلاف جنگ کر رہی ہے میرے دور میں اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی، شاہ فیصل نے جو اس وقت سعودی عرب کے بادشاہ تھے اور مسلمانوں کے انتہائی مقدس مقامات کے متولی اور پاسبان حرم تھے یہ تجویز کیا کہ میں سربراہ کانفرنس کا چیئرمین ہوں گا، اور میں صرف اس سربراہ کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا گیا بلکہ اب بھی اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تو میں اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کروں گا۔ میں اُس وقت تک اس صورت میں ایسی کانفرنس کی صدارت کر سکتا ہوں جب کہ عدالت عظمیٰ اس کا اہتمام کرے شاہ فیصل مجھے ۱۹۵۸ء سے جانتے تھے۔ اگر ان کو میرے ایمان کے بارے میں رتی بھر شبہ ہوتا تو وہ کیوں کہتے کہ یہ کانفرنس پاکستان میں ہو، اسلامی ممالک انڈونیشیا سے تیونس تک پھیلے ہوئے ہیں یہ کانفرنس قاہرہ میں بھی ہو سکتی تھی، کسی اور ملک میں بھی ہو سکتی تھی لیکن شاہ فیصل نے کہا کہ اس کانفرنس کے لئے وہ پاکستان کو تجویز کرتے ہیں۔ نوے سالہ قادیانی مسئلہ خوشگوار طریقے سے حل ہوا، ۱۹۷۳ء کے آئین میں پہلی بار اسلامی آئیڈیالوجی کا ذکر ہوا۔

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حج سے تمام پابندیاں اٹھائی گئیں حج کے لئے کوٹہ سسٹم ختم کیا گیا۔ برطانوی دور سے ریڈ کراس کا رکھا ہوا نام تبدیل کر کے ہلال احمر رکھا گیا اور اتوار کے بجائے جمعہ کی چھٹی کی گئی میرے وزراء نے کہا کہ یہ ممکن نہیں مگر میں نے ممکن کر دکھایا، شراب پر پابندی عائد کی گئی، مگر آج بے تحاشہ شراب بھارت سے اسمگل ہو کر پاکستان آ رہی ہے مقدمہ قتل کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کیس میں محرکات کا موضوع بہت واضح استغاثہ نے بتایا کہ اتنے راؤنڈ قتل کرنے کے لئے فائر کئے گئے مگر ان خولوں کو تبدیل کر دیا گیا، ہم خولوں کی تبدیلی کے کسی امکانی نظریہ پر انحصار نہیں کر سکتے جب تک یہ نہ ہو کہ میں نے اپنی بندوق کی

نالی سے خود حملہ کر کے قتل کر دیا ہو'اس کیس کی دوبارہ تفتیش کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب اس حکومت کے آنے کے بعد ایف آئی اے نے کیس کی تفتیش شروع کی تو مجھ سے کسی نے پوچھ گچھ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ میں مملکتی معاملات جاننے کے بارے میں بہت زیادہ تجسس رکھتا تھا مگر دیگر تمام لوگوں کو حراست میں لینے سے پہلے ایک شخص کو چار چھے ہفتے حراست میں رکھا گیا اور اس سے تمام تفصیلات پر مشتمل سوصفحات کا ایک خط لے لیا گیا' دوسرے نے ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک واضح بیان دے دیا' دن کے وقت فوجی سپاہیوں نے گنوں سے میرے گھر کے دروازے توڑ ڈالے اور میرے کمرے میں گھس آئے اس کے بعد مجھے آرمی کے ایک دستے نے گرفتار کرلیا اب یہ بات ریکارڈ پر آ گئی ہے کہ تفتیشی افسر عبدالخالق نے اقبالی ملزموں کو رشوت پیش کی تھی اور دباؤ ڈالا گیا' احمد رضا قصوری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میں نے دھمکی دی کہ میں ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا دوسرے طرف یہ بھی کہا گیا کہ میں نے کہا تھا کہ ڈھاکہ جانے والے ایک طرف کا ٹکٹ لے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک طرف کا ٹکٹ لے جانے کی اجازت تھی تو ٹانگیں توڑنے کا کیا مطلب ہے' وہ لوگ ڈھاکہ میں بیٹھے ہوں گے۔ میں یہاں بیٹھے ہوئے ان کی ٹانگیں کیسے توڑ سکتا ہوں جب کہ دونوں حصوں کے درمیان عظیم بحیرہ عرب حائل ہے چیئر مین نے کہا کہ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ کس منہ سے وہاں جائیں گے اور کس طرح اپنے قدموں پر کھڑے ہوسکیں گے اور عوام کو آخر کیا بتائیں گے' اس کیس کی تفتیش کے بارے میں جسٹس شفیع الرحمٰن رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس رپورٹ کو نہ چھاپنے کے بارے میں ایک خط پر میرے دستخط ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں اس رپورٹ کو چھپوانا نہیں چاہتا تھا رپورٹ تو پہلے ہی چھاپی جا چکی تھی اس لئے مسٹر جسٹس وحیدالدین اور مسٹر جسٹس حلیم نے حکومت کے بارے میں سوالات پوچھے تھے کیونکہ شفیع الرحمٰن رپورٹ میں چار ممکنہ محرکات کا ذکر تھا اور اسلام آباد کے واقعہ کے بارے میں جو تحریک استحقاق احمد رضا قصوری نے پیش کی تھی اس میں سرے سے کسی محرک کا ذکر ہی نہیں سعید احمد خان کو تو آزاد گواہ کہا گیا ہے اس کے باوجود یہ دخل اندازی اور دباؤ

کا الزام لگایا گیا انہوں نے کہا کہ میرا نکتہ یہ ہے کہ حمید باجوہ' سعید احمد خان کے ماتحت تھا اور اس کی ہدایت پر عمل کرتا تھا' اگر باجوہ پر الزام عائد کیا گیا ہے اور اسے شریکِ ملزم اور شریک سازش کہا گیا ہے تو یہ بات زیادہ بہتر طور پر سعید احمد خان کے خلاف استعمال ہوتی ہے' اس لئے کہ سعید احمد خان اس کا افسر تھا اور اس بات کے بعد سعید احمد خان کسی طرح بھی آزاد گواہ نہیں ٹھہرتا' اقبالی ملزمان کے بیانات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سب کے سب بیانات میں خود کو بری الذمہ قرار دے کر مجھے ملوث کیا گیا ہے اور قانونی طور پر یہ اقبالی بیان قابلِ قبول نہیں ہوتا اس الزام کا ذکر کیا کہ میں نے مبینہ طور پر مسعود محمود کو میاں عباس کے لئے ایک پیغام دیا کہ قصوری کو قتل کر دیا جائے مسعود محمود ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا اس لئے مجھے کسی اور شخص کو درمیان میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی استغاثہ کے گواہ مسٹر ویلش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اس کا نام ویلش ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ میں پکا مسلمان ہوں' نہ کہ صرف احمد رضا قصوری کے بارے میں فائل عدالت کے ریکارڈ میں موجود ہے اگر مجھے ایسے مجرم ہونے کے بارے میں احساس ہوتا اور مجھے خیال ہوتا کہ یہ فائل میرے جرم کی گواہ ہے تو میں اسے غائب کروا سکتا تھا۔ وائٹ پیپر میں یہ باتیں لکھیں ہیں کہ بھٹو نے اپنی ساری فائلیں اور دستاویزات محفوظ رکھی تھیں' میں نے وائٹ پیپر کا جواب بڑی محنت اور پورے اخلاص سے دیا تھا' میری چھوٹی سی کوٹھڑی کے مسلح گارڈ مجھے ڈسٹرب کرتے اور مجھے کوئی سہولت بھی میسر نہیں تھی اس کے باوجود میں نے رمضان کی راتوں میں جاگ کر وائٹ پیپر کا یہ جواب لکھا' اور یہ میرا پختہ خیال تھا کہ یہ بالکل متعلقہ دستاویز ہے میں اسے کہیں استعمال نہیں کر رہا تھا۔

''مائی لارڈ!'' میں ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا میرا اپنا ضابطہ اخلاق ہے میرا کردار اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ جب ایک پولیس افسر نے مصطفیٰ جتوئی سے زیادتی کی تو میں نے ان کے گھر جا کر ان سے معافی مانگی اس وقت میں صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا' میں نے وائٹ پیپر کا جواب کا پیاں بنوانے اور فوٹو اسٹیٹ بنوانے کے لئے دیا تھا' جناب یحیٰ بختیار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے نیک نیتی کے ساتھ اسے چھاپنے کے لئے

دے دیا' انہوں نے یاد دلایا کہ جب بیگم نصرت بھٹو کیس میں حلفیہ بیان داخل کرا آئیں تو مسٹر اے کے بروہی نے یہ بیان عدالت میں دینے سے پہلے ہی پریس کو جاری کر دیا اس سلسلہ میں عدالت کے حکم کا پابند ہوں اور مجھے امید ہے کہ فاضل چیف جسٹس کسی مناسب موقعہ پر اس کو شائع کرنے کا حکم صادر فرمائیں گے' میں عدالت کے احکامات کی پابندی ضروری خیال کرتا ہوں اور جب لاہور ہائی کورٹ میں مارشل لاء کے حکم نمبر۱۲ کے تحت میری نظر بندی کے خلاف میری درخواست مسٹر جسٹس کرم الٰہی چوہان کے سامنے زیر بحث تھی تو میں نے عدالت کے حکم پر اپنا بیان حلفی چھپوانے سے روک دیا تھا' اقبالی ملزموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملزموں نے کہا ہے کہ انہیں قصوری کے قتل پر مجبور کرنے کے لئے دھمکیاں دی گئیں' میں وزیراعظم تھا میرے پاس بے شمار ذرائع تھے مجھے کسی کو دھمکی دینے کی کیا ضرورت تھی' اور اس کے لئے ملزموں کا یہ بھی بیان ہے کہ ان کو اس پر مجبور کرنے کے لئے ایک سپر ٹیم تیار کی گئی جو نہ صرف قصوری کو قتل کرنے کا کام کرے گی بلکہ بعد میں ان لوگوں کو بھی ختم کر دے گی' یہ فضول باتیں ختم کرنے کے لئے سرداری اور جاگیرداری نظام ختم کیا اور ایسی ساری باتیں ختم کرائیں' قتل کے واقعہ میں استعمال ہونے والے اسلحہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان کے پاس چینی ساخت کا اسلحہ ہے جو کہ فوج کے پاس اور سول فوجی تنظیموں کے پاس بھی ہے' اس لئے یہ کہنا کہ ۶۲ ۷ ایم ایم کے اسلحہ کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے خط لکھا گیا' باڑہ اور درہ آدم خیل سے معلوم کیا گیا' ڈیفنس سیکریٹری کو خط لکھا گیا۔ ان باتوں کی کیا ضرورت تھی جسٹس شفیع الرحمٰن رپورٹ کو نہ چھاپنے کے بارے میں کہا کہ ایسے کمیشن کی رپورٹیں چھاپنے کے بارے میں بعض ضروری باتیں دیکھی جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں مثال حمود الرحمٰن کی رپورٹ ہے اس لئے میں نے سوچا کہ میں اس پر اپنا وقت کیوں ضائع کروں ابھی پچھلے سال ملتان میں فائرنگ ہوئی تھی معلوم نہیں اس کی رپورٹ شائع ہوئی ہے یا نہیں اس لئے میں نے اس لیٹر پر یہ لکھا ہے کہ اس کے بارے میں خود معلوم کرو کہ اسے چھپنا چاہیے یا نہیں اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ مقدمہ قتل کی ایف آئی آر کے بارے میں

کہا کہ اس میں میرا نام اس طرح ہے کہ قتل کا محرک اس کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے یاد دلایا کہ ملک کا پہلا وزیر اعظم قتل کیا گیا مگر اس کے قتل کی ایف ائی آر درج نہیں ہوئی' میں نے عطاء اللہ مینگل سے کہا تھا کہ میری آپ سے مخالفت ہے آپ کے بیٹے سے نہیں اس حادثہ کے سارے کوائف جنرل ٹکا خان کو معلوم ہیں اور میں اس کے متعلق اور یہاں کچھ نہیں چاہتا' میں اس پر بھی آمادہ ہوں کہ خود عطاء اللہ مینگل کی سربراہی میں جرگہ اس سانحہ کی تفتیش کرے مینگل خوددار شخص ہیں اور حالات سے باخبر ہیں انہوں نے کہا کہ خود مجھ پر کئی قاتلانہ حملے ہوئے' بلوچستان کا لیڈر عبدالصمد اچکزئی جو کہ میرا دوست تھا قتل ہو گیا' لاہور ہائی کورٹ میں تعصب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۵ نومبر کو لکھے گئے ایک فیصلہ میں ۱۵ نومبر کو ہونے والے بیگم بھٹو کے کیس کا ذکر کیا ہے' فیصلہ میں کئی خامیاں ہیں' اس مرحلہ پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ اگر آپ وقت پر بات کریں تو ٹھیک ہے' اگر سارے ملک کے قاتلانہ حملوں کا ذکر کریں تو یہ غیر ضروری ہوگا' اس مرحلہ پر جناب یحییٰ بختیار نے کہا کہ یہ باتیں استغاثہ کی طرف سے کی گئی ہیں اگرچہ اس بارے میں کوئی بات ریکارڈ پر موجود نہیں ہے چیئرمین نے احمد رضا قصوری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء لگنے کے بعد افتخار تاری نے میرے خلاف مقدمات درج کرائے اور قصوری نے قومی اسمبلی میں اسلام آباد کے واقعہ کے بارے میں جو تحریک استحقاق پیش کی اس میں بھی اس نے کہا کہ یہ حملہ افتخار تاری کے ایماء پر کرایا گیا ہے کیونکہ تاری کی اس کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی' پشاور میں ۱۹۷۱ء میں' میں نے جب پریس کانفرنس کی تھی۔ اس نے مشرقی پاکستان جا کر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بارے میں جو بات کی تھی اس میں میں نے کہیں بھی بائیکاٹ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اسمبلی کے اجلاس میں ۱۲۰ دن کے اندر اندر آئین نہ بنا تو اسمبلی ختم ہو جائے گی' ہمارا کہنا یہ تھا کہ اُس وقت پاکستان کی شکل کینفیڈریشن کی تھی یہ صحیح معنوں میں فیڈریشن نہیں تھی ہم ایک فیڈریشن میں تو اپوزیشن میں بیٹھنے کو تیار تھے لیکن اگر یہ کینفیڈریشن ہے تو اس میں ایک ریاست کی اکثریت کو دوسری ریاست کی اکثریت کے برابر حقوق حاصل ہوتے ہیں اس لئے میں نے کہا تھا کہ ادھر سے ہم اُدھر سے تم مل کر ایک عالیشان مخلوط حکومت

بنائیں اس کے بعد کراچی میں پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے ایک اجلاس میں جس میں احمد رضا قصوری بھی شامل تھا۔ میرے مؤقف کی تائید کی گئی اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے میاں محمود علی قصوری، عبدالحفیظ کاردار اور راو اور مختار رانا ذاتی طور پر میرے مخالف تھے مگر میں نے ذاتی مخالفت پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جہاں تک ڈھاکہ جانے کا تعلق ہے ہم قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد خود ڈھاکہ گئے تھے اور عوامی لیگ کے ساتھ بات چیت کی تھی استغاثہ کا کہنا ہے کہ میں نے کوئٹہ میں احمد رضا قصوری کے قتل کا حکم دیا، اگر قصوری کو قتل بھی کروانا ہوتا تو میں اتنی خوفناک غلطی نہیں کرسکتا تھا کہ پنجاب کے کسی ایم این اے کو بلوچستان یا بلوچستان وسندھ کے کسی ایم این اے کو پنجاب میں قتل کرواتا، کیونکہ سیاسی طور پر اس کے بارے میں ہولناک نتائج برآمد ہوتے یہ کام میں کسی صورت میں نہیں کرسکتا تھا اور میں یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا، قصوری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے کوئی پوچھے کہ اس کا باپ دادا میں سے بھی کوئی منٹو مورے اصلاحات کے بعد سے کبھی منتخب ہوا ہے یہ شخص صرف میری وجہ سے ایم این اے بنا، قصور کے علاقہ میں میاں افتخارالدین اور احمد علی منتخب ہوئے تھے مگر یہ شخص اسمبلی تو کجا کبھی بلدیاتی انتخابات میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا، قصوری کی ہمیشہ شکایات آتی تھیں کبھی یہ پولیس افسروں سے بدتمیزی کرتا کبھی آ کر بڑے فخر سے کہتا کہ میں ایک جگہ گیا تو وہاں بریگیڈیر جنرل بیٹھے تھے جن کو میں نے اُٹھا دیا، یہ لوگ شکایات کرتے تھے مگر میں اس کو تحفظ دیا کرتا تھا، اس شخص کا کردار یہ تھا کہ ۱۹۶۷ء میں پیپلز پارٹی کا رکن بنا پھر معطل ہوگیا، ۱۹۷۰ء میں پھر رکن یا پھر فارورڈ بلاک بنالیا پھر نکالا گیا پھر اس نے تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور تحریک میں بھی فارورڈ بلاک بنالیا اور اس نے دوبارہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور ٹکٹ مانگنے لگا، یہ اس کی منصوبہ بندی تھی بات یہ نہیں ہے کہ اس کی منصوبہ بندی تھی بلکہ بات یہ ہے کہ اس نے ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت اس لئے کی تھی کہ بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا۔

اور اب بھی ایک شخص چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے چیئرمین نے ڈائس پر زور سے مُکا مارتے ہوئے کہا کہ اس شخص کا یہی معیار ہے جس پر وہ کسی کی حمایت کرتا ہے اس شخص نے

اپنے باپ کے مبینہ قاتل سے نہیں بلکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے تعاون کیا تھا اور ایک شخص کو باپ کا قاتل بھی بناتا ہے اور اس سے تعاون کو منصوبہ بندی بھی قرار دیتا ہے اس نے میری تعریف میں ایک ''تحریک فکر قائد عوام'' بھی بنائی اس کے خلاف اب بھی کیس درج ہیں یہ شخص استغاثہ کا سب سے بڑا گواہ ہے' قصوری کیا ہے' اس کے بارے میں خود جنرل ضیاء الحق نے کیہان انٹرنیشنل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ قصوری کوئی چیز نہیں اور اس کو قتل کرنے کی بات مشکوک ہے اگر کوئی شخص ذوالفقار علی بھٹو جیسے شخص کو قتل کرنے کی سوچے تو اس میں کسی کا مفاد ہو سکتا ہے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی جانتے ہیں کہ مجھے قتل کرنے میں کن لوگوں کا مفاد ہے مجھے قتل کرنے میں امیر لوگوں' بورژوا طبقہ' رجعت پسندوں' دائیں بازو والوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا مفاد ہے اور یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے' یہ ایک قتل کا کیس ہے اور مجھے قتل کی کسی وجہ کا کوئی علم نہیں جب یہ قتل ہوا تو میرا ردعمل یہ تھا کہ مجھے بڑا افسوس ہوا میں نے راؤ رشید سے پوچھا کہ نواب محمد احمد خان کیسے قتل ہو گیا مجھے اب بھی اس پر افسوس ہے' انہوں نے بڑے اثر انداز الفاظ میں کہا میری سوچ بہت بلند ہے میں قومی سطح اور اعلیٰ قومی سطح کا لیڈر رہوں میرے مقاصد اعلیٰ اور قومی سطح کے ہیں۔ میرے عزائم بین الاقوامی اور اعلیٰ بین الاقوامی نوعیت کے ہیں میں نے اس شخص کی ہمیشہ مدد کی میں اتنی چھوٹی باتیں نہیں کرتا' انہوں نے جذبات سے بھری ہوئی آواز میں کہا کہ مجھ پر یقین کریں کہ میں نے اس تفتیش کی بھرپور کوشش کی میں بہت برداشت کرنے والا آدمی ہوں میں اس سارے کیس کے بارے میں لاعلم اور بے بس ہوں' جب میرا نام ایف آئی آر میں درج ہوا تو قدرتاً میں نے ایس پی وغیرہ سے پوچھا مجھے یہ پتہ نہیں کہ وارث اور احمد کون ہیں میرے لئے دنیا کے بے شمار مسائل ہیں مجھے عوام کو متحد کرنا ہوتا ہے مجھے بین الاقوامی معاملات کو دیکھنا ہوتا ہے اگر اس قتل میں معمولی سی شہادت بھی مل جائے تو مجھے پھانسی چڑھا دیں اور اس میں صرف بعض لوگوں کا غصہ بھٹو کے خلاف ہے بعض کا اشتعال بھٹو کے خلاف ہے میں نے ہائی کورٹ میں صرف ایک لفظ ڈیم ایٹ کہا تو چیف جسٹس نے چیخ کر کہا کہ اس شخص کو دور لے جاؤ جب تک یہ ہوش میں نہ آ جائے حالانکہ ڈیم ایٹ کوئی گالی نہیں ہے

قائداعظمؒ نے بھی یہ الفاظ استعمال کئے ہیں میں غیر جانبداری چاہتا ہوں' مجھے ایک سال سے بولنے نہیں دیا گیا' اس عدالت نے میرا حق مجھے دے دیا ہے مجھے بات کرنے کی اجازت دی ہے میں نے اپنا حق حاصل کرلیا ہے آپ اب مجھے پھانسی پر بھی چڑھا دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کوئی پرواہ نہیں قصوری کے باپ کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی میرے پاس بڑے بڑے مسائل تھے میں اتنی معمولی باتوں پر نہیں جاتا' پاکستان پیپلز پارٹی ایک انقلابی پارٹی ہے اور آج بھی یہ پارٹی پوری طرح میری کمان میں ہے میری پارٹی میں مسلم لیگ کی طرح کسی قسم کا چھٹہ یا پگا راگروپ نہیں اور پیپلز پارٹی چور دروازے کی بجائے انتخاب کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے کی سیاست پر یقین رکھتی ہے میرے کردار اور رویئے کا فیصلہ کرنا عوام کا کام ہے نہ کہ کسی عدالت کا ۱۹۷۰ء میں جب میں انتخاب لڑ رہا تھا تو ہم پر کفر کے فتوے لگائے گئے تھے بلکہ باہر سے درآمد کئے گئے تھے لیکن میں نے علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کو لاہور میں ۴۰ ہزار ووٹوں سے شکست دی اس طرح میں نے مولوی حامد علی کو ۴۷ ہزار ووٹوں سے ہرادیا ملک کے عوام کی اکثریت نے مجھے مسلم لیڈر کی حیثیت سے اپنا رہنما منتخب کیا اور صدر بنایا یہ کہا گیا کہ ایف ایس ایف کو میں اپنے تمام جلسوں کی زینت بنانے کے لئے استعمال کرتا تھا' میرے جلسوں میں عوام کی تعداد کے مقابلے میں یہ نفری سمندر میں قطرے کے برابر تھی' احمد رضا قصوری کو دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کے بارے میں حقائق بیان کرتے ہوئے کہا کہ سعید احمد خان اس آدمی کو دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کا خواہشمند تھا اور اس نے مجھے اس سلسلہ میں فائل بھیجی کہ میں رضا قصوری کو انٹرویو کے لئے وقت دوں لیکن میں نے اس فائل پر صرف دستخط کئے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے فائل دیکھ لی ہے وہ ایک ایسا شخص نہیں تھا اس وقت انٹرویو کے لئے سردار عزت حیات خاں اور دوسرے بہت سے لوگ بھی کوشش کر رہے تھے یہ چونکہ قطعی طور پر پیپلز پارٹی کا معاملہ تھا اس لئے اس فائل کو پارٹی سکریٹریٹ بھی بھیجا گیا پیپلز پارٹی ایک قومی پارٹی ہے جس کے تمام صوبوں میں دفاتر موجود ہیں' رضا قصوری کے معاملہ پر بھی مرکزی مجلس عاملہ نے یہی کہا کہ وہ ذہنی طور پر غیر متوازن شخص ہے اس لئے اسے دوبارہ پارٹی میں شامل

کرنے کا معاملہ مسترد کر دیا گیا تھا' پیپلز پارٹی میں اس کے شامل ہونے کا معاملہ قطعی طور پر پارٹی کا معاملہ تھا اور حکومت کا مسئلہ نہیں تھا' پنجاب میں پارٹی کے معاملات شیخ رشید اور ملک معراج خالد کے پاس تھے اسی طرح سندھ میں ممتاز بھٹو اور پیرزادہ تھے اس موقع پر فاضل چیف جسٹس نے دریافت کیا کہ یہ فائل پارٹی سکریٹریٹ سے لی گئی تھی' جناب بھٹو نے کہا کہ جی ہاں یہ پارٹی سکریٹریٹ سے لی گئی تھی' جناب بھٹو نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے درخواست کی کہ سرکاری وائٹ پیپر کے جواب میں ان کا جواب شائع کرنے کی اجازت دی جائے اس الزام کی تردید کی کہ ان کی جانب سے لکھا جانے والا وائٹ پیپر سپریم کورٹ میں پیش کئے جانے سے قبل شائع کر دیا گیا تھا' میری پارٹی کے رکن میرے زبردست شیدائی ہیں وہ بہت بہادر ہیں اگر انہیں میری لکھی ہوئی ذراسی تحریر بھی مل جائے تو کیا وہ اسے شائع نہیں کریں گے' میرے آٹھ کارکنوں نے اپنے آپ کو زندہ جلا لیا ہے یہ کوئی مذاق نہیں تھا کوئی اپنی ایک انگلی تک نہیں جلا سکتا رضا قصوری نے ہر پارٹی میں گروپ بنائے کبھی وہ فارورڈ بلاک بناتا رہا کبھی بیک ورڈ بلاک بناتا رہا اور کبھی سائڈ ورڈ بلاک بناتا رہا۔ برائے مہربانی آپ موڈ میں ہوں تو میرے وائٹ پیپر کو شائع کرنے کی اجازت دیجئے کیونکہ وہ بہت اہم ہے میاں عباس نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے غلام مصطفےٰ کھر کے تاج پورہ کے جلسہ میں سانپ بھیجے تھے تاکہ جلسہ درہم برہم کیا جا سکے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میں نے سانپ بھیجے ہوتے تو آج مصطفےٰ کھر بل میں گھسے ہوتے لیکن اس کے برعکس مصطفےٰ کھر بیرون ملک جا کر میرے لئے کام کر رہے ہیں وہ میرے انتہائی مخلص ہیں' انہوں نے اپنی ساری جائیداد قرق کرانے کا خطرہ مول لے رکھا ہے' میں اختلاف رائے رکھنے والوں کا احترام کرتا ہوں اور میں نے کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی' پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر ملک جعفر نے مجیب الرحمان کے چھ نکات کی حمایت میں پاکستان ٹائمز میں مضامین لکھے۔

چیف جسٹس: وہ پھر بھی آپ کی پارٹی میں رہے' جناب بھٹو: نہ صرف رہے بلکہ ان کو وزیر بنا لیا گیا۔ چیف جسٹس: ملک جعفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بیٹھے ہوئے ہیں' اس کے بعد جناب بھٹو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ملک جعفر اپنی سیٹ پر کھڑے ہو گئے۔

ہماری پارٹی کے کارکن بڑے جیالے ہیں میں احمد رضا قصوری کو قتل کیوں کرواتا اگر میں چاہتا تو میرے پاس ایسے جیالے کارکن موجود ہیں جو کسی بھی شخص کو ہتھیلیوں پر مل کر اس کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں لگا لیتے' اور پتہ بھی نہیں چلنے دیتے لیکن میں ایسا کیوں کرتا کیونکہ میں تو ایسے نظام ہی کے خلاف ہوں اس کے لئے میں نے سرداری اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کیا' پیپلز پارٹی میں کوئی گروپ نہیں ہے یہ ایک انقلابی پارٹی ہے اور آج بھی پوری طرح میری کمان میں ہے۔ میں عدالت عظمیٰ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے بولنے کا موقع دیا ہے میں اپنے عوام کو بتانا چاہتا تھا' میں نے مسعود محمود سے کبھی اس مسئلہ پر بات تک نہیں کی' مقدمہ مکمل طور پر جھوٹا اور من گھڑت ہے یہ بات بیمار ذہن کی ایجاد ہے ۱۹۷۶ء سے پہلے میں نے کبھی میاں عباس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ میں نے کوئٹہ میں ویلش سے قصوری کے معاملہ میں کوئی بات نہیں کی اب یہ عدالت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں میں ذہانت کو کام میں لائے مجھے تقریباً دو سال میں پہلی مرتبہ بولنے کا موقع دیا گیا ہے میں کہتا رہا کہ مجھے بولنے کا موقع دو میں نے کہا کہ خدا کے لئے میری بات سنو' تمہیں ایک بے گناہ کی جان لینے کا کوئی حق نہیں اور تم نے اسکی جان لینی ہی ہے تو پہلے اس کی بات سن لو' مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں پبلسٹی چاہتا ہوں۔ اس لئے کھلی عدالت میں سماعت کا مطالبہ کر رہا ہوں' قانون کی ساری تاریخ میں کھلی عدالت میں سماعت کی حمایت کی گئی' امریکہ اور برطانیہ میں خفیہ سماعت کو غلط سمجھا گیا ہے اور امریکہ میں اس مقصد کیلئے آئین میں چھٹی ترمیم کی گئی ہے خفیہ سماعت شدید بے انصافی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مجھ پر پبلسٹی حاصل کرنے کا الزام لگانے والو تم مجھے پھانسی دینا چاہتے ہو۔ تم مجھے قاتل کہتے ہو تمہارا ریڈیو' ٹی وی میرے خلاف بکواس کرتا رہتا ہے' میں پھانسی کی کوٹھڑی میں قید ہوں پچھلے ایک سال سے ساری حکومت اور غیر منتخب وزیروں کا اور کوئی کام نہیں ہے سفارتخانے اس مقدمہ کا پروپیگنڈہ کرنے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کر رہے ہیں' ہر جگہ اس مقدمہ کی باتیں ہو رہی ہیں تم ایک بے گناہ آدمی کو مارنا چاہتے ہو' میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جس سے کسی کو پریشانی ہو میں کسی ادارے کو اسکینڈلائیز نہیں کرنا چاہتا اور جب میں نے ایک دفعہ اس کی ضمانت دی ہے تو میں اس کا پابند

ہوں میں اپنے الفاظ سے منحرف نہیں ہوں گا اس سارے مقدمہ میں مقدمے کے سارے واقعات میں' میں شامل نہیں ہوں صرف محرکات کے موضوع میں میرا ذکر ہے اور کوئی ایسی بات نہیں کہ میں نے مسعود محمود کو قتل کرنے کے بارے میں کہا ہو یا اس سے سازش کی ہو' اس مقدمہ میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ میں اس میں زبردستی پھنسایا گیا ہوں ۱۸ دسمبر کی درخواست کے بارے میں مختصر ذکر کروں گا چیمبر میں کی گئی سماعت اور بند کمرے میں کی جانے والی سماعت کا ذکر کروں گا' آج پرانے ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے ہیں لوگوں کو ایک لفظ بولنے نہیں دیا جا رہا میرا سوال یہ ہے کہ عدالت صورت حال کو دیکھے اور اس کا جائزہ لے لاہور ہائی کورٹ میں اپنی ضمانت کی تنسیخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس صمدانی نے مجھے ضمانت پر رہا کیا' اس کے بعد مجھے مارشل لاء کے ضابطہ نمبر ۱۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا میں جیل میں تھا اس کے بعد صورت حال میں تبدیلی آئی اور ایک ملزم میاں عباس استغاثہ کے حق میں اپنا بیان دینے سے منحرف ہو گئے اور ماہر اسلحہ کی منفی رپورٹ آئی جس نے استغاثہ کا سارا کیس تباہ کر کے رکھ دیا مگر اس کے باوجود فل بنچ نے میری ضمانت منسوخ کر دی۔

استغاثہ کے سب سے اہم وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے متعلق کہا کہ اس کی گواہی مکمل طور پر مسترد کئے جانے کے لائق ہے میں سازش یا محرکات میں سے ایک نکتہ پر عدالت کو مطمئن کر دوں تو دوسرے نکتہ پر مطمئن کرنے کے لئے مجھے کوئی قانونی ضرورت باقی نہیں رہے گی مسعود محمود کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نچلی عدالت میں اس کے تقرر کے مسئلہ کو خواہ مخواہ اچھالا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہ جیسے کوئی اہم تقرر تھا' بات حقائق کے بالکل خلاف ہے اس نے ۱۹۴۸ء میں پولیس کی نوکری شروع کی اور ملک کے باہر رہا ۱۹۵۸ء میں یہ ڈھاکہ میں تھا' جب لسانی فسادات شروع ہوئے اس نے متعدد حکومتوں میں اہم پوزیشنوں پر خدمات انجام دیں۔ کسی حکومت نے اس کے خلاف ایکشن نہیں لیا اسے کبھی معطل نہیں کیا گیا۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ میں ہمیشہ گندے انڈے اکٹھے کرتا تھا مسعود محمود کا تقرر کوئی خاص تقرر نہ تھا یہ معمول کا تقرر تھا اس میں کسی نے کوئی خاص سفارش نہیں کی تھی جس نے بھی بات کی اس کی صلاحیتوں کی بنیاد پر

کی' یہ ایسے ہی ہے جیسے معمول میں کسی شخص کے متعلق رائے دیتے ہیں جہاں تک ریکارڈ کا تعلق ہے یحیٰی خان کے دور آخر میں بہت سی فائلیں دیکھی گئی تھیں کسی نے عبدالحفیظ پیرزادہ کو یہ بات ٹیلی فون پر بتائی اور یہ بات درست نکلی مسعود محمود صلاحیتوں کی بنیاد پر اس عہدے کا حق دار تھا اس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے مناسب عہدہ دیا گیا ہے یہ بات درست ہے وہ اس عہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے' مسعود محمود کے انٹرویو کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ ایک معمول کا انٹرویو تھا جب بھی کوئی افسر اچھا کام کرتا ہے تو اس کو بہتر جگہ دینے کے لئے بلایا جاتا ہے' جب کسی کو سفیر مقرر کیا جاتا ہے تو اس سے بھی انٹرویو لیا جاتا ہے مسعود محمود کے اپنے بیان سے ظاہر ہے کہ جب اس سے انٹرویو لیا گیا تو اس کا آغاز معمول کی علیک سلیک کے سوا اس کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کی گئی یہ سلسلہ ایوب خان نے شروع کیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے تقرر سے قبل بھی ان سے انٹرویو لیا جائے' میرے خیال میں یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی یہ وہ طریقے ہیں جو ساری دنیا میں رائج ہیں اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں مسعود محمود کو بھی اس کی پہلی ملاقات میں بتایا گیا تھا کہ ایف ایس ایف کو سول فورس کی امداد کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے علاوہ میاں عباس کے بارے میں اس معزز عدالت کو پوری ذمہ داری سے یقین دلاتا ہوں کہ میں میاں عباس کے وجود سے واقف نہیں تھا' مسعود محمود نے ۱۹۷۶ء میں ایک دفعہ مجھ سے ذکر کیا تھا کہ میاں عباس ایک اچھا افسر ہے وہ بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہے' میں اس بات کی صداقت کے لئے حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں کسی میاں عباس کو نہیں جانتا' مسعود محمود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا انہوں نے سوال کیا کہ وہ ایف ایس ایف سے کیوں الرجک تھا یہ اس کی لائن تھی اس کا پیشہ تھا وہ ایڈیشنل سکریٹری بنایا گیا تو وہ خوش نہیں تھا اس لئے کہ اس کی لائن کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ میں نے اسے مقرر کیا تو پہلی ہی ملاقات میں اسے قصوری کو قتل کرنے کو کہا؟ ڈپلومیسی کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے ہی دن میں اس سے ٹیلی فون پر بات کروں اور کہوں کہ فلاں جرم کرو' وہ ۲۴ سال نوکری کر چکا تھا ایک سال بعد ریٹائرڈ ہونے والا تھا مگر نوکری

میں اس کے ریٹائرڈ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا یہ بات بالکل غلط ہے کہ ایف ایس ایف میرے ماتحت تھی اور یہ وزارت داخلہ کا کام تھا قیوم خاں اس کے وزیر تھے اور یہ ان کا ماتحت تھا مسعود محمود نے مجھے کئی دفعہ کہا کہ میں یہ فورس براہ راست اپنے پاس رکھ لوں میں نے انکار کیا اور کہا کہ میں اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا میں نے اسے کہا تھا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ماتحت اپنے افسر کا حکم نہ مانے اسے ہر صورت میں اپنے افسر کے احکامات کی پابندی کرنا ہو گی، خان قیوم اچھے اور قابل ایڈمنسٹریٹر تھے انہوں نے ایف ایس ایف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ راولپنڈی میں میرے جلسہ عام میں ۲ لاکھ افراد تھے جب کہ یہاں پر ایف ایس ایف کے افراد کی تعداد ایک ہزار تھی اور یہ معمولی تعداد جلسے۔کے حاضرین کی تعداد میں کیا اضافہ کر سکتی تھی اس بات کی بھی تردید کی کہ انہوں نے ایف ایس ایف کے لئے روزانہ دو گھنٹے مختص کئے ہوئے تھے مسعود محمود کے اس بیان کا ذکر کرتے ہوئے کہا جو اس نے نظر بندی کے دوران دیا تھا کہ اس نے چالیس دن حراست میں گذارے اسے ایک سوالنامہ دیا گیا اس کے پاس اس کا اسسٹنٹ عبدالحق تھا اسے اسٹینوگرافر مہیا کیا گیا، اسے پرسکون ماحول میسر تھا، ایک جج کے ریمارکس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں پر گھوڑے کی سواری کا لطف اٹھاتا رہا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور ریس کورس میں گھوڑے دوڑانے کے راستے کس طرح تبدیل کئے جا رہے ہیں ایک تو اس کا بیان مکمل نہیں ہے اور دوسرے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے تو اس سے بھی خراب ہے اس نے ہائی کورٹ کے سامنے آ کر اپنی نامکمل باتیں مکمل کیں۔اس سلسلہ میں مسٹر جسٹس صفدر شاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ نکتہ استغاثہ کے خلاف جاتا ہے غلام حسین کا کہنا تھا کہ اس کی ڈیوٹی قومی اسمبلی میں تھی مگر وہ قصوری کو نہیں جانتا تھا آخر مسعود محمود جانتا کیا تھا؟ اس کو منصوبے کا علم نہیں تھا اس کے پاس کوئی نظریہ نہیں تھا اس کا کہنا ہے کہ اس کو صرف ایک پیغام میاں عباس کو یاد دلانا تھا، لاہور کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملتان میں میری رہائش صادق قریشی کے گھر تھی اور مسعود محمود ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا کہنا ہے کہ میں نے صبح ساڑھے چھ بجے اٹھ کر اسے اس واقعہ کے بارے میں ٹیلیفون کیا، پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے

کبھی ڈائریکٹ ٹیلی فون نہیں کیا اور نہ ہی میں ڈائریکٹری اٹھائے پھرتا تھا میرا اے ڈی سی صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آتا تھا اپنے خلاف لکھے جانے والے وائٹ پیپر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا اس میں لکھا ہے کہ میں نے رفیع رضا کو کہا کہ سیکروفون پر بات کیا کرو اگر میں مسعود محمود سے قتل کے جرم پر بات کرتا تو کیا سیکروفون پر نہ کرتا جب کہ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں ہر بات سیکروفون پر کیا کرتا تھا' حنیف رامے استغاثہ کا ایک گواہ تھا استغاثہ نے کہا وہ وکیل صفائی نے جیت لیا ہے مگر اس سلسلہ میں کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی' مسعود محمود کا کہنا ہے کہ میں نے قصوری کے قتل کے لئے دو تین دفعہ اسے ٹیلی فون کیا میں وزیراعظم تھا میرے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں تھا کہ میں ہر قیمت پر اس کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرتا مسعود محمود نے کہا ہے کہ بھٹو میرا مخالف ہے' حالانکہ وعدہ معاف گواہ بنانے کے لئے دوستی کا ہونا ضروری ہے دشمنی کی وجہ سے وعدہ معاف گواہ نہیں بنایا جا سکتا یہ کہتا ہے کہ میں نے بچوں اور بیوی کے بارے میں دھمکیاں دیں حالانکہ میں نے اس کو اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے مقرر کیا تھا' کیا میں اپنے بچوں کے محافظ کو دھمکیاں دے سکتا ہوں' اپنے بچوں کو دھمکیاں دے سکتا تھا انہوں نے بتایا کہ ہائی کورٹ میں مسعود محمود کی سچائی کو پرکھنے کے لئے اس کے کردار کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا مجھ پر قتل کا الزام ہے' موت کی سزا دی جا رہی ہے مگر مجھے ایک گواہ کی سچائی کو پرکھنے کی اجازت نہیں ہے مجھے اسے جھوٹا کرنے کا موقع نہیں دیا جا رہا' مسعود محمود ایک بے گناہ کی زندگی کو ختم کرنے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے ہم اس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے ایک سوال بھی نہ کر سکیں مسعود محمود نے کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا تھا مجھے اپنے بیٹے میر مرتضیٰ علی خان بھٹو پر فخر ہے وہ ایک دلاور اور بہادر نوجوان ہے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے' فاضل چیف جسٹس نے ایک موقع پر کہا کہ مسعود محمود نے مصطفیٰ کھر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مصطفیٰ کھر جس قسم کی حرکت کر رہا ہے اگر میرا بیٹا بھی ایسی حرکت کرتا تو میں اُسے قتل کرا دیتا۔

اس نے جو بھی کہا تھا کہ جس حوالے سے بھی یہ بات کہی تھی کہ یہ بالکل غیر ضروری اور فضول تھی میں نے مصطفیٰ کھر کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں کہی میں اسے اپنے گھر کے ایک رکن

کی حیثیت دیتا ہوں مگر اس سے سیاسی اختلاف کی کہانی ایک علیحدہ داستان ہے مگر اس وقت بھی جب وہ آتا تھا تو وزیراعظم ہاؤس میں ٹھہرتا تھا' ہم دونوں اکٹھے شکار کھیلا کرتے تھے آج مصطفیٰ کھر کیا کر رہا ہے اس کو کیا ترغیبات نہیں دی گئیں' حکومت کے اعلیٰ ترین افراد نے ان سے باتیں کیں مگر اس نے ساری پیش کش مسترد کر دیں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں نے مصطفیٰ کھر کے بارے میں ان سے کوئی بات کی ہو' مسعود محمود کا بیان جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں مسعود محمود کا کردار یہ ہے کہ وہ سیٹھ عابد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا' سازش کا اُسے علم نہیں قتل کے پروگرام سے وہ لاعلم ہے کمانڈر عبرت سے وہ ناواقف ہے تو پھر وہ وعدہ معاف گواہ کس بات کا ہے؟ عدالت میں کیا بتانے آیا ہے مسعود محمود کو گرفتار کیا گیا تو اسے آفیسرز میس راولپنڈی میں رکھا گیا تھا اس کے بعد اسے ایبٹ روڈ لے جایا گیا' پھر اسلام آباد لایا گیا اگر یہ شخص کوئی بدنام مجرم بھی نہیں تھا اور سیاست دان بھی نہیں تھا تو پھر اسے مارشل لاء لگانے کے ساتھ ۵ جولائی کو کیوں گرفتار کر لیا گیا تھا' مارشل لاء لگنے کے کئی دنوں بعد تک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے میرے متعلق اچھے ریمارکس دیئے تھے اور مسعود محمود کو اس مقدمے کے سلسلے میں گرفتار نہیں کیا گیا تھا اور حکومت نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے ابتداء میں اس قتل کا علم نہیں تھا آخر مسعود محمود کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا یہ سوال طنزیہ انداز میں پوچھا گیا تھا۔

اس موقع پر جناب یحییٰ بختیار نے اٹھ کر کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کیس مارشل لاء سے پہلے چیف مارشل لاء کے علم میں تھا اور انہیں علم تھا کہ وہ گواہ ہے یہ کیس مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے تیار کر لیا گیا تھا اعجاز بٹالوی نے جواب دیا کہ یہ شخص یہ جانتا تھا کہ ایف ایس ایف کیا کرتی ہے جناب بھٹو نے کہا کہ میں اس بحث میں نہیں پڑتا پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے سوال کا جواب ہی نہیں دیا اور دوسری بات یہ ہے کہ راؤ رشید کو جو ایف ایس ایف میں سے نہیں تھا کیوں ۵ جولائی کو گرفتار کیا گیا اس کے علاوہ سعید احمد خاں کو ۹ جولائی کو اور اکرم شیخ ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا صرف سیکریٹری داخلہ ایم کے چودھری کو گرفتار نہیں کیا گیا اس کو بھی حال ہی میں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے جب تک معاہدوں کو ثابت نہ کیا

جائے سازش ثابت نہیں ہوسکتی اور اگر یہ معاہدہ دباؤ کے تحت تحریر ہونے والا معاہدہ قرار نہیں پاتا اس کے بغیر سازش کا وجود ہی سامنے نہیں آتا سازش کو ثابت کرنا دور کی بات ہے اگر الٹ طور پر پہلے سازش ثابت کی جائے تو پھر معاہدہ ثابت کیا جائے تو پھر یہ گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے باندھنے کی بات ہوگی گھوڑا بندھ تو جائے گا مگر گاڑی نہیں چلے گی اگر اس طرح الٹے طریقے سے سازش ثابت کی جائے تو کسی بھی دو آدمیوں کے درمیان کی جانے والی گفتگو کو معاہدہ قرار دے دیا جائے مسعود محمود نے اپنے ابتدائی بیانات میں نامکمل باتیں کی ہیں اور پھر عدالت کے سامنے آ کر اپنے بیان کو ایف آئی آر اور میری ۳ جون کی تقریر سے ہم آہنگ کرنے کے لئے تبدیلیاں کیں اس کے بعد انہوں نے مسعود محمود کے بیان کے کچھ حصہ پڑھ کر سنائے اس میں اہم اضافوں کو واضح کیا۔ مسعود محمود نے شہادت کے دوران بتایا تھا کہ یہ سازش پہلے حق نواز ٹوانہ میاں عباس اور میرے (جناب بھٹو) کے درمیان تھی اس وقت حق نواز ٹوانہ زندہ تھا۔ مگر اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا' مسعود محمود نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اس سازش میں شریک ہوا بلکہ اس نے صرف ایک حکم میاں عباس تک پہنچایا' وکیل کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ ٹوانہ کی سازش کو ثابت کرنے میں ناکام ہوگیا تو اس نے کہا کہ میں صرف مسعود محمود کی سازش کا ذکر کرتا ہوں ہمارا اس کیس میں اور کسی سازش سے تعلق نہیں جب سازش کے بیج کا ہی ذکر نہیں تو اس سے پھول آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' مسعود محمود نے اپنے بیان میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ اس سازش میں حصہ دار تھا اگر اس کا سازش میں کوئی دخل ہوتا تو اسے اسلام آباد کے واقعہ' اسلحہ کی فراہمی اور حملہ کرنے والے افراد کا علم ہوتا اور دوسرے وعدہ معاف گواہ کا بھی کچھ علم نہیں ہوتا مگر اسے کچھ پتہ نہیں معاہدہ کا وجود اس ساری سازش کا اہم ترین نکتہ ہے یہ انتہائی ضروری اور لازمی ہے اور معاہدہ کا ذکر ہی ساری سازش کا مرکز ہے اس کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی کوئی بھی مسترد کیا گیا افسر ایک حکومت ختم ہونے کے بعد سابقہ حکومت کے بارے میں جو چاہے کہنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے لئے اسے معمولی سی تکلیف پہنچے تو وہ جیسا حکم ہو ویسا بیان دے دے گا دیکھنا یہ ہے کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے یہ آواز کس کے منہ سے آ رہی ہے'

یہ زبان ایک وعدہ معاف گواہ کی ہے جس نے خودغرضی سے اپنی جان بچا کر دوسرے بے گناہوں کی جان پھنسادی ہے اس طرح ایک کمزور گواہ کی گواہی کو جانچنے کے لئے دوہرے معیار رکھے۔

ہائی کورٹ میں کہا گیا ہے کہ میں ثابت کروں کہ میں بے گناہ ہوں' ہر دفعہ شک کا سارا فائدہ استغاثہ کو دے دیا گیا' نچلی عدالت میں ثبوت دینے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی تھی نہ صرف ایک دفعہ بلکہ بہت دفعہ ایک دفعہ ایک جج نے گواہ وکیل خان سے سوال کیا' کیا انسپکٹر غلام حسین آپ کو ملا تھا وکیل خان نے انکار کیا تو اسے دوبارہ نام بتایا گیا' گواہ نے دوبارہ انکار کردیا' انہوں نے کہا اول تو مسعود محمود قابل اعتبار گواہ نہیں اور اگر یہ قابل اعتبار ثابت ہو جائے تو پھر اس کی گواہی کی پوری تائید آزاد گواہوں سے ہونی چاہیے تب جرم ثابت ہوسکتا ہے سعید احمد خان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دو غلط باتیں مل کر ایک سچ نہیں بن سکتیں' لیکن ہمارے ملک میں یہ ہورہا ہے کہ افسروں کو دوبارہ لایا جارہا ہے مسعود محمود کو توہین عدالت کے الزام میں جسٹس ذکی الدین پال کی عدالت سے چھ ماہ کی سزا ہوئی جو کہ ایک قتل کا اقبالی مجرم ہے' وہی مسعود محمود جو کمانڈر عبرت والا ہے اس کی نوکری بحال ہے وہ نہ ریٹائر ہوا اور نہ برطرف ہوا ہے بلکہ ابھی تک کام کررہا ہے لیٹرل سروس والوں کو برطرف کیا جارہا ہے' مگر مسعود محمود بھی تو لیٹرل سروس کا تھا۔

میری جڑیں عوام میں مضبوط ہیں عوام میرے ساتھ ہیں میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوں جسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو اور جو کچھ ہورہا ہے عوام اسے دیکھ رہے ہیں' اگر آج مارشل لاء اٹھالیا جائے تو آپ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے' حالات اگر معمول پر ہوں تو معلوم ہو جائے گا کہ عوام کس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں قذافی اسٹیڈیم لاہور میں میری اہلیہ کو لاٹھی چارج سے زخمی کردیا گیا تو میرے عوام نے ان کے سر سے بہنے والے خون کو ایک چادر میں ڈال کر حضرت لعل شہباز قلندر کی درگاہ میں پیش کیا اور کہا ''دیکھیں یہ کیا ہورہا ہے'' ہم کسی صورت میں اس کی اجازت نہیں دے سکتے چیف جسٹس مسلسل میری بے عزتی کرتے تھے ان کے ہر عمل سے تعصب ظاہر ہوتا تھا لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میرے خلاف ایک تفتیشی ایجنٹ کے طور پر کام کررہے تھے اور میرے خلاف شکایت کنندہ بھی بن گئے' مجھے پھانسی کی کوٹھری میں جلد منتقل کرنے میں انہوں نے

گہری دلچسپی لی' ہائی کورٹ میں مقدمے کی سماعت کے دوران کا ایک واقعہ بیان کیا جس میں جسٹس جمیل حسین رضوی کا ذکر تھا اس وقت جسٹس مشتاق حسین قائم مقام چیف جسٹس تھے گواہ نے مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی کو چیف جسٹس کہہ دیا جس پر جسٹس مشتاق حسین نے ٹوکا کہ وہ چیف جسٹس نہیں تھے اس موقع پر میں نے کہا کہ آپ کی باری بھی آ جائے گی اس پر جسٹس مشتاق حسین سیخ پا ہو گئے اور میرے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرانے کی ہدایت کی' آپ کی باری بھی آئے گی کوئی بری بات نہیں ہر مسلمان کی باری آتی ہے اس موقع پر فاضل جسٹس نے کہا کہ آپ نے کل بھی کہا تھا کہ ججوں کی باری بھی آئے گی لیکن ہم نے آپ کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کرائی۔

جناب میں نے کہا تھا کہ اگر چوتھا مارشل لاء لگا تو جج بھی نہیں رہیں گے' میں غیر جانبداری سے کہتا ہوں کہ آج ملک کی صورت حال انتہائی نازک اور سنگین ہے' اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو موجودہ سیاسی بحران کا کوئی حل کارآمد نہ ہوگا' جتنی جلدی ممکن ہو سکے عوام کو کاروبار حکومت میں شامل کیا جائے اور ان کا تعاون حاصل کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے ورنہ ایک وقت آئے گا کہ جب سب اچھے حل بیکار ہو کر رہ جائیں گے' اگر انتخابات وقت پر نہ ہوئے تو بے فائدہ ثابت ہوگا اور جتنی دیر ہوتی چلی جائے گی سیاسی بحران کو حل کرنے کے لئے قابل قبول حل اتنا ہی دور ہوتا چلا جائے گا وقت کے حساب سے مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جاتا ہے ورنہ وقت گذرنے کے ساتھ سب کچھ بے کار ہو کر رہ جائے گا انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ جنرل یحییٰ نے پاکستان کے ٹوٹنے کے بعد آئین دیا اس طرح سے وقت گذرنے کے بعد کوئی بھی حل قابل عمل نہیں رہتا انہوں نے کہا کہ مجھے شبہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھا تھا کہ پاکستان اپنے قیام کے بیس پچیس سال بعد ختم ہو جائے گا کہیں یہ بات صحیح ثابت نہ ہو۔

مارشل لاء نے قوم سے جنگ کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے قوم کو بدل کر رکھ دیا ہے' یہ مارشل لاء عوام کے مسائل حل کرنے کا حل نہیں ہے بلکہ ایک خلیج میں تبدیل ہو چکا ہے کوئی ہزاروں سال نہیں رہا کسی نے لاکھوں سال حکومت نہیں کی عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں۔

سیزر آیا' نپولین آیا اور چلا گیا' ہٹلر ایک ہزار سال تک اپنے اقتدار کی بات کرتا تھا مگر وہ دس سال میں ہی صفحہ ہستی سے مٹ گیا اس لئے جتنی جلد ہو سکے بحران کا حل تلاش کیا جائے اس پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ اس وقت ہم اس معاملہ پر کوئی بات نہیں کر سکتے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یہ کیس سپریم کورٹ میں آ جائے' جناب بھٹو نے فوراً کہا کہ جناب والا۔

میرے بارے میں اور موجودہ حکومت کے بارے میں دو معیار رکھے گئے ہیں تم جو کچھ کر رہے ہو اگر میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اس سے بہتر کر سکتا تھا' مجھ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ میں نے آئین میں یک طرفہ ترامیم کی تھیں جب کہ میں نے یہ ترامیم پارلیمنٹ کی منظوری سے جمہوری طور پر کی تھیں' آج کس قسم کی ترامیم کی جا رہی ہیں آج قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے میں نے تو آئین کے مطابق ترامیم کی تھیں آج آئین کہاں ہے آج جداگانہ طریقہ انتخابات کا سلسلہ شروع کر کے آئین کو پامال کیا گیا ہے' یہ ساری باتیں عارضی ہیں صدر یحییٰ سے میں نے کہا تھا کہ آپ کا تیار کردہ لیگل فریم ورک آرڈر اسمبلی کے آنے پر ختم ہو جائے گا جو بھی احکامات آج دیئے جا رہے ہیں وہ آنے والی اسمبلی ختم کر دے گی' اور نئی اسمبلی پہلا کام یہ کرے گی کہ وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے گی اور جو کچھ بھی آج کیا جا رہا ہے وہ سب کچھ ختم ہو جائے گا ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں فوجی ٹربیونل اور نااہلی کے ٹربیونل قائم ہو رہے ہیں اس مرحلہ پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ آپ وہ باتیں نہ کریں جو ہماری دلچسپی کی نہیں ہیں' جناب والا میں خود کو روک رہا ہوں' سیاستدانوں کو نااہل قرار دینے کے لئے نااہلی کے ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ جن کو نااہل قرار دیا گیا وہ اپنی نااہلی کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں سابقہ حکومت نے اس قسم کا کام پہلے بھی کیا تھا کبھی پراوڈا لگایا گیا کبھی ایبڈو کیا گیا اب نااہل کیا جا رہا ہے جنہوں نے دوسروں کو پراوڈا کیا ان کو پراوڈا ہونے والوں نے پراوڈا کیا جنہوں نے دوسروں پر ایبڈو لگایا تھا ان کو ایبڈو ہونے والوں نے ایبڈو کر دیا' انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا جب ان کے نااہل کرنے والوں کو نااہل کر کے رکھ دیں گے' بدنیتی ثابت کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ ایک جائز حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے وہ ایک

منتخب اور جائز حکومت کا بغاوت کے ذریعہ تختہ الٹ دینے کے اقدام کا عدالتی نوٹس لیں آپ کا کام ہے کہ آپ اس بات کا عدالتی نوٹس لیں یا نہ لیں کم از کم میری گذارشات پر ضرور غور کریں اضافی آئینی اقدامات کو جائز حکومت کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ بدنیتی کی بنیاد ہے اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عدالت کے نوٹس میں اخبارات کے تراشے لانا چاہتا ہوں جو اس مقدمہ کے بارے میں مختلف لوگوں نے ملکی اور غیر ملکی پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہے ہیں۔

اس پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ ہم ہر ممکن انسانی صلاحیت کے اعتبار سے اس کیس کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں گے اور اس پر کسی بھی شخص کے ملک کے اندر یا باہر دیئے جانے والے ریمارکس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا آپ کے وکلاء نے تمام مقدمہ بڑی محنت اور قابلیت سے پیش کیا ہے ہم نے دونوں طرف کے وکلاء کے دلائل سن لئے ہیں اور ہم وکلا کی امداد کرنے پر ان کے ممنون ہیں جناب والا میں آپ کی مہربانی کا ممنون ہوں' میں اخلاقی طور پر مطمئن ہو گیا ہوں میں ایک بے گناہ شخص ہوں اور اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ مقدمہ نہ سیدھی ٹانگ پر رکھا گیا ہے نہ ٹیڑھی ٹانگ پر یہ ایک لنگڑا لولا مقدمہ ہے انصاف کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا انصاف قطعی ہوتا ہے' سیاست میں سودے بازی ہو جاتی ہے لیکن انصاف میں نہیں ہو سکتی ایک شخص یا تو معصوم ہے یا گناہ گار یا تو کیس ثابت ہوتا ہے یا نہیں' سوائے اس کے کوئی ایسا بیرونی عنصر بیچ میں آ جائے جس کی وجہ سے ملکی مفاد کو ترجیح دینا مقصود ہو' مثال دیتے ہوئے کہا کہ ایک یورپی ملک میں کہا گیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا میں پوری ذمہ داری سے درخواست کرتا ہوں کہ عدالت قانون کی حکمرانی کو سربلند کرنے کا کام کرے اور مارشل لاء کی دایا نہ بنے جہاں تک بدنیتی کا تعلق ہے ایک فاضل جج نے کہا ہے کہ اگر یہ مقدمہ دلائل کی بنیاد پر تباہ کر دیا جائے تو اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں' میں اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ دلائل کے اعتبار سے یہ مقدمہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گیا ہے اور اس کے جھوٹے دلائل کی دھجیاں بکھری جا چکی ہیں' اس لئے میں ان باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا' میں نے لاہور ہائی کورٹ میں کوئی پریس کانفرنس نہیں کی تھی اس میں میرا قصور نہ تھا یہ ایس پی کا قصور تھا کیونکہ مجھے جس جگہ بٹھایا جاتا میں وہیں بیٹھا رہتا'

جہاں مجھے کھڑا ہونے کو کہا جاتا میں کھڑا رہتا یہ کوئی پریس کانفرنس نہیں تھی بی بی سی کا نامہ نگار ۵نومبر کو قائم مقام چیف جسٹس سے مل کر آ رہا تھا راستے میں وہ مل گیا اس طرح غیر ملکی نامہ نگار بھی موجود تھے۔ انہوں نے غیر رسمی طور پر پوچھا تھا کہ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں آپ کی صحت وغیرہ کیسی ہے مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ یہ پریس کے لوگ تھے اگر کوئی یہاں آ کر میرا حال پوچھے تو کیا یہ پریس کانفرنس ہو گی چیف جسٹس میرے خلاف تھا وہ میرا دشمن تھا وہ مجھ سے تعصب رکھتا تھا۔ چیف جسٹس نے یہ بھی کہا کہ یحییٰ بختیار نے میرے ذہن میں چیف جسٹس کے خلاف مواد بھرا تھا' یحییٰ بختیار میری کابینہ میں تھے یا میں ان کی کابینہ میں تھا میں ان کا وزیراعظم تھا یا وہ میرے وزیراعظم تھے وہ میری کابینہ میں اٹارنی جنرل تھے لاہور ہائی کورٹ میں مولوی مشتاق کو چیف جسٹس نہ مقرر کرنے کا فیصلہ میں نے کسی کے کہنے پر نہیں کیا تھا' میں کسی کے ہاتھ میں کھیلنے والا نہیں ہوں میں انہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں' میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں' اس میں میری عزت سیاسی کردار اور مستقبل کا سوال ہے میں اپنے فیصلے خود کرنا جانتا ہوں' میں نے ایسی باتیں نہیں کیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' مولوی مشتاق کہتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں ایوب کے دورِ حکومت میں میرا مقدمہ سنا اور مجھے بری کرایا اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۸ء میں ایوب خان نے مجھے گرفتار کیا۔ اور میرے خلاف کیمپ جیل لاہور میں مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی جس میں محمود علی قصوری میرے وکیل تھے' کسی بات پر میرا مولوی مشتاق سے جھگڑا ہو گیا تھا میں اس وقت جوان تھا اور کچھ باتیں اور بھی تھیں جن کی وجہ سے میں سماعت کا بائیکاٹ کر کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا' جس پر قصوری نے مجھے سمجھایا اس طرح میری رہائی کی وجہ ان کا فیصلہ نہیں تھا کہ یہ عوام کا دباؤ تھا' اس وقت نظر بندوں کو رہا کیا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اگرتلہ سازش کیس کے ملزم شیخ مجیب الرحمان کو بھی رہا کر دیا گیا پیپلز پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی نے اپنے ۳۱ اگست کے اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی تھی کہ پارٹی کو چیف الیکشن کمشنر کی حیثیت سے مولوی مشتاق کی تقرری منظور نہیں یہ اس وقت کی بات ہے جب کیس بھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہم نے کہا تھا کہ ہمیں جانبدار الیکشن کمشنر نہیں چاہیے امیں نے ۵نومبر کو درخواست دی جو چیف جسٹس کی پریس

کانفرنس کے بارے میں تھی جس میں چیف جسٹس نے کہا کہ مقدمہ کی کھلی سماعت ہوئی اور ملک کے مروجہ قوانین کے مطابق ہوئی میں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ چیف جسٹس کو اس طرح کے زیر سماعت مقدمات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہیے ہماری درخواست میں کہا گیا کہ یہ غیر ضروری ہے خفیہ سماعت کے احکامات سے پہلے میں تین ماہ تک خاموش رہا جب کہ مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے رہے لیکن جب خفیہ سماعت کے احکامات دیئے گئے تو آپ جان سکتے ہیں کہ ایسے معاملات میں کیا جذباتی حالت ہوسکتی ہے۔

قانونی اختیارات کو جابرانہ طریقے سے اختیار نہیں کرنا چاہیے میں ہائی کورٹ کو اپنی پبلسٹی کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتا تھا' عدالت نے سماعت خفیہ رکھ کر خود بڑا اسکینڈل بنا دیا ہے چیف جسٹس کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۰ دسمبر کو میری اہلیہ قذافی اسٹیڈیم میں پولیس کے لاٹھی چارج سے زخمی ہوگئیں اور ۱۷ تاریخ کو میں نے ان کی لہولہان تصویر دیکھی تو میں بہت ڈسٹرب تھا اور میرے لئے کہا کہ اس شخص کو باہر لے جاؤ جب تک اس کے اوسان بحال نہ ہو جائیں' اس طرح وہ شخص جس نے چھ ماہ پہلے ملک کے سربراہ کا چارج چھوڑا تھا اسے پاگل قرار دے دیا گیا یہ عدالت کے تعصب کی انتہا تھی اس موقعہ پر وکیل سرکار ایم اے رحمان نے کھڑے ہو کر کہا کہ مسٹر بھٹو غلط کہہ رہے ہیں جب کہ مولوی مشتاق حسین نے نہایت شفقت کے انداز میں یہ باتیں کہی تھیں جناب بھٹو نے کہا کہ نہیں' اس پر جناب غلام علی میمن نے چیف جسٹس کا متعلقہ حکم پڑھ کر سنایا اور بتایا کہ چیف جسٹس نے یہ مشفقانہ باتیں کہی تھیں جس کے بعد جناب یحیٰی بختیار نے مسٹر رحمان سے کہا کہ آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں تو آپ بطور گواہ آئیں میں آپ پر جرح کرنے کو تیار ہوں۔

جناب بھٹو نے عدالت کے تعصب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عدالت خود تحقیقاتی ایجنسی بن گئی تھی جب ایک گواہ نے منصورہ میں بموں کے دھماکوں کے لئے کسی جگہ کی نشاندہی کی تو عدالت نے حکم دیا کہ موقعہ واردات کا معائنہ کیا جائے جب کہ اس مقصد کے لئے ایف آئی آر پہلے دن درج کرائی جاسکتی تھی لیکن عدالت خود تحقیقاتی ایجنسی بن گئی' چیف جسٹس خود شکایت کنندہ

بن گئے جب عدالت میں جسٹس رضوی کا ذکر آیا تو چیف جسٹس نے اسے خود پر لے لیا اور کہا کہ ابھی چیف جسٹس کی باری نہیں آئی وہ اس مرحلے پر پہلی بار مسکرائے تھے اور میں نے پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی جس پر میں نے کہا کہ آپ کی بھی باری آئے گی میں نے یہ بات کسی بری نیت سے نہیں کہی تھی بلکہ سارے مسلمانوں کی باری آنی ہے آپ کی بھی آئے گی کیونکہ وہ متعصب تھا اس لئے اُس نے میرے خلاف ظفر اللہ کو شکایت درج کرائی۔

اپنی بیماری کے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ۱۱ نومبر کا واقعہ ہے میں دیہاتی آدمی ہوں مچھر کاٹنے کی وجہ سے میرا منہ سوج گیا ہے اور مجھ پر ملیریا اور انفلوئنزا کے دو حملے ہوئے اور پھر مجھے قولنج کی تکلیف بھی ہوگئی تھی۔ مجھے ایک سو تین درجہ بخار تھا میں نے درخواست دی کہ گواہوں پر جرح کی کارروائی دو روز تک ملتوی کر دی جائے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ میری عدم موجودگی میں ۱۵ تاریخ کو ویلش۔ اصغر خاں اور وکیل خاں جیسے اہم گواہوں پر جرح کی گئی اور میں وکلاء کو ہدایت نہ دے سکا۔ بیماری کے ان دنوں میں سوائے جیل کے ڈاکٹر کے اور کسی نے میرا علاج نہیں کیا۔ ۱۶ تاریخ کو چیف جسٹس نے مسٹر اعوان سے پوچھا کہ آپ کا موکل کیسا ہے تو اس نے کہا کہ کچھ بہتر ہے تو چیف جسٹس نے میڈیکل بورڈ تشکیل دے دیا اور اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا کہ کھوکر خان ہے یا اسے بھی انفلوئنزا ہو گیا ہے کیا چیف جسٹس کی اس بات سے تعصب کی مثال نہیں ملتی اس سے اگلے دن جب عدالت میں آیا تو ہمیں احکامات دیئے گئے کہ آئندہ عدالتی کارروائی صبح ۹ بجے سے شام ساڑھے چار بجے تک ہوا کرے گی عدالت اور کوٹ لکھپت جیل کا فاصلہ خاصا ہے اور آنے جانے میں ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے پھر سیکورٹی کے انتظامات میں بھی دیر ہو جاتی تھی میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا اس لئے میں وکیلوں کو ہدایت نہ دے سکا۔ میں نے درخواست دی کہ عدالتی کارروائی کے وقت میں کمی کی جائے میرے وکیل نے کیا جرم کیا تھا کہ ان کی درخواست رسمی طور پر مسترد کرنے کے بجائے ان کے منہ پر دے ماری انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ رفیق شاہ کو ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ کوٹ لکھپت جیل سے آیا کریں جب کہ دوسری طرف میری بیٹی اور بیوی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں ان کو بتایا گیا

کہ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے جب جسٹس شفیع الرحمان رپورٹ پر بحث ہو رہی تھی کہ میں ڈی ایم اعوان سے بات کرنا چاہتا تھا تو ہمیں کہا گیا کہ کوریڈور میں بات کریں دو منٹ بعد جب ہم واپس آئے تو چیف جسٹس نے طنزیہ انداز میں کہا کہ کوئی اور درخواست نہ دینا کوریڈور میں سیکورٹی والے کھڑے تھے اس لئے مسٹر اعوان سے مشورے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے میز پر مکہ مار کر عدالت کی توہین کی ہے میں ایسا شخص نہیں ہوں جو حقائق کی توہین کرے مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس سے عدالت کی توہین ہوتی ہے۔ ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا میں ایسا شخص نہیں ہوں۔ جس کی جڑیں عوام میں نہ ہوں لوگوں کو میرا خیال ہے مجھے تکلیف ہوتی ہے تو ان میں اضطراب پیدا ہوتا ہے میری حالت کی وجہ سے عوام میں ناراضگی ہے میں اس کا ذکر اس لئے نہیں کر رہا کہ تکلیف ہے۔ مسز اندرا گاندھی گرفتار ہوئیں تو مظاہرے شروع ہو گئے آج مارشل لاء اٹھ جائے تو دیکھیں کیا ہوتا ہے مظاہرے شروع ہو جائیں گے جو اس وقت مارشل لاء کی وجہ سے نہیں ہو رہے ہیں آج ملک میں کوئی قانون نہیں جب عام صورت حال ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے میں نے اس جولائی کو سابق صدر نکسن کی خودنوشت سوانح حیات پڑھی اس میں ان کے وکیلوں نے ایک جگہ مسٹر نکسن کو بتایا کہ اگر یہ کہہ دیں کہ وقت یاد نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے ۱۸ دسمبر کو عدالت کے تعصب کے بارے میں ایک درخواست لکھی مگر ۱۹ دسمبر کو سماعت اچانک ملتوی ہو گئی اور کہا گیا کہ چیف جسٹس اچانک راولپنڈی چلے گئے ہیں پھر سردیوں کی چھٹیاں کر دی گئیں۔ ۵ جنوری کو جب عدالت دوبارہ لگی تو مجھے چیمبر میں کیوں بلایا گیا میں چیمبر گیا تو وہاں پر تمام جج بیٹھے ہوئے تھے میں نے عدالت کے ججوں کو کبھی چیمبر میں نہیں دیکھا تھا میں چیمبر میں داخل ہوا تو میرے ساتھ چیف جسٹس نے کہا کہ آپ بیٹھئے وہاں پر اور بھی کرسی خالی تھی میں بھی بیٹھ گیا مگر چیف جسٹس نے فوراً کہا کہ ملزم ہو کر تم نہیں بیٹھ سکتے تم کھڑے ہو جاؤ۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور میں کھڑا ہو گیا چیف جسٹس نے کہا کہ اس پر دلائل دو میں نے کچھ دلائل دیئے اور ساتھ ہی کہا کہ میں اپنے وکلاء سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں پھر میں نے اعوان کو

بلایا انہوں نے بھی چند منٹ دلائل دیئے پھر چیف جسٹس کہنے لگے تم عجیب آدمی ہو کبھی کہتے ہو خود بولو گے کبھی کہتے ہو وکیل سے مشورہ کرو گے، وہاں وکیل تھا نہ پریس تھا پھر چیف جسٹس نے کہا کہ یہ موچی گیٹ نہیں ہے سیاسی تقریر نہ کرو لیکن یہ عدالت کا چیمبر تھا اور یہاں قانون کی بات ہو رہی تھی سیاسی تقریر کی کیا ضرورت تھی۔ ۲۵ تاریخ کو یہ خبر شائع ہوئی کہ شاید مجھے اس عدالت میں منصفانہ سماعت نہ مل سکے لیکن ۲۴ تاریخ کو یہ خبر شائع ہوئی کہ میں نے عدالت پر اعتماد کا اظہار کیا ہے اس خبر کو شائع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سپریم کورٹ میں میرے وکلاء مشکل میں پڑ جائیں گے۔ مجھے ۵ جولائی کو گرفتار کیا گیا جس کے بعد مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا پھر رہا کیا گیا اور چند دن بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا یہ کیس جلدی شروع ہو جاتا مگر بعض خاص باتیں تھیں۔ مسٹر غلام علی میمن نے ہائی کورٹ میں دو درخواستیں دیں جس میں ایک درخواست اہم آئینی مداخلت کے بارے میں تھی جس میں بعض اہم نکات اٹھائے گئے تھے میں نے عدالت سے درخواست کی کہ مجھے بھی دلائل کی اجازت دی جائے جس پر مجھے کہا گیا کہ مجھے مکمل اجازت دی جائے گی اور گھنٹوں بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ یہ کوئی خفیہ سماعت کی عدالت نہ تھی بلکہ کھلی عدالت تھی ۸ اکتوبر کو جب میمن کے دلائل ختم ہوئے تو میں بولنے کے لئے کھڑا ہو گیا تو فوراً کہا گیا کہ مجھے جو کہنا ہے وہ زبانی کہنے کی بجائے تحریری شکل میں پیش کیا جائے اور اگر کسی اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے تو وہ مل جائے گا میں نے انتہائی نرمی سے عدالت کو یاد دلایا کہ پہلے آپ دو مرتبہ مجھے بولنے کی اجازت دے چکے ہیں اس لئے مجھے بولنے کا موقع دیا جائے یہ بڑے اہم آئینی نکات ہیں جس پر میں دلائل دینا چاہتا ہوں جس پر عدالت نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا عدالت کے دو متضاد احکامات تھے جس میں ایک میں اجازت دی اور دوسرے میں اجازت نہیں دی گئی۔ ۹ اکتوبر کو یہ درخواست خارج کر دی گئی، اور ۱۱ اکتوبر کو اس کیس کی سماعت کا آغاز ہوا۔

عدالت میں کٹہرا بنائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کٹہرا جسٹس نیگرس کے دور میں بھی نہیں بنایا گیا تھا۔ عدالت نے بتایا کہ کٹہرے میں بھی عام طور پر بینچ رکھے ہوئے ہوتے ہیں آپ کو کرسی اس لئے دی گئی ہے آپ کو جسمانی طور پر تکلیف نہ ہو۔ جس پر میں نے کہا میں

شکرگزار ہوں کہ مجھے کرسی دی گئی ہے کٹہرے میں میرے بائیں جانب ایس پی زمان اور ایس پی ذکاءاللہ بیٹھے ہوئے تھے جب کہ دائیں جانب اسپیشل برانچ اور انٹیلی جنس بیورد (ڈی آئی بی) کے لوگ تھے اگر میں کسی کو سلام علیکم یا گڈ مارننگ بھی کہتا تو وہ کان لگا لیتے اور میری ایک ایک بات سنتے اس طرح دونوں جانب منکر نکیر بٹھائے گئے اس طرح میں اپنے وکلاء تک سے بات نہ کر سکتا تھا۔ ۷ ادسمبر کو لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں پولیس کے لاٹھی چارج سے میری اہلیہ زخمی ہو گئی تھیں میں طلعت یعقوب سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں رہی تھیں۔ ڈی ایم اعوان دور بیٹھے تھے وہ میری بات نہیں سمجھ رہے تھے جس پر میں نے ڈیم ایٹ کے الفاظ کہے کہ میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تم میری بات سمجھ نہیں پا رہے ہو میں نے ذہنی طور پر غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے ڈیم ایٹ کہا تھا۔ اس موقع پر فاضل چیف جسٹس نے پوچھا کہ احمد رضا قصوری کی جرح کے دوران آپ کو وکلاء سے مشورہ کرنے کا موقع دیا گیا جس پر جناب بھٹو نے کہا کہ مجھے غیر ضروری طور پر مصیبت اٹھانی پڑی جو کہ نہ کسی روایت کے مطابق اور نہ ہی قانون کے مطابق ہے اس کا آپ صرف اندازہ لگا سکتے ہیں، صحیح صورت حال معلوم نہیں کر سکتے میں نے اپنے وکلاء کو ہدایت دینے کے لئے بات کی تھی اور جو کچھ ذہن میں ہوتا ہے وہ خیال ہوتا ہے اپنے ذہن کے سارے خیالات دوسرے تک نہیں پہنچا سکتے اور بہت سی باتوں پر دوسروں کو ہدایت نہیں دے سکتے اس پر وکیل سرکار ایم اے رحمان نے کہا کہ ان کے وکیلوں نے لاہور ہائی کورٹ میں بہت دن تک جرح کی ہے انہیں پورا موقع ملا ہے مسٹر رحمان نے کہا کہ جہاں تک کٹہرے کی بات کی گئی ہے تو یہ صرف لکڑی کی باڑ بنائی گئی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ مسٹر بھٹو کو علیحدہ بٹھایا جا سکے اور مسٹر بھٹو جہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنے وکلاء کے سامنے تھے وہ اپنے وکلاء سے آسانی سے بات کر سکتے تھے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ مسٹر بٹالوی نے تو کوئی ایسی وضاحت پیش نہیں کی تھی ہم ساری تفصیل میں جا چکے ہیں۔

ضمیمہ (ب)

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے نام خط

جناب سکریٹری جنرل!

''جنرل اسمبلی جنگ اور امن اور شاید انسانی حقوق پر اپنے موجودہ سیشن میں غور وفکر کرتے ہوئے یہ یاد رکھے کہ پاکستان کے منتخب رہنما کے ساتھ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد کیسا ظالمانہ سلوک ہو رہا ہے۔ ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے مجھے گذشتہ ڈیڑھ سال سے تشدد اور اذیتوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس نا قابل برداشت سلوک کی وجہ سے مجھے دو مرتبہ اپنی عزت نفس کی خاطر بھوک ہڑتال پر مجبور ہو جانا پڑا ۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو میری بیوی پر شرمناک حملہ کیا گیا اور اسے زخمی کر دیا گیا۔ جنوری سے وہ نظر بند ہے اور میری نو جوان بیٹی کو بھی نظر بند رکھا گیا ہے۔ میرے تین چھوٹے بچے اور متعدد دوست جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہزاروں پارٹی لیڈر اور ورکر جیلوں میں ہیں۔ صحافیوں کو قید کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کوڑے تک لگائے گئے ہیں۔ مزدوروں کی آواز دبانے کے لئے گذشتہ جنوری میں ان کا قتل عام کیا گیا۔

ضمیمہ (ب)

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے نام خط

جناب سکریٹری جنرل!

''جنرل اسمبلی جنگ اور امن اور شاید انسانی حقوق پر اپنے موجودہ سیشن میں غور وفکر کرتے ہوئے یہ یاد رکھے کہ پاکستان کے منتخب رہنما کے ساتھ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد کیسا ظالمانہ سلوک ہو رہا ہے۔ ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے مجھے گذشتہ ڈیڑھ سال سے تشدد اور اذیتوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس نا قابل برداشت سلوک کی وجہ سے مجھے دو مرتبہ اپنی عزت نفس کی خاطر بھوک ہڑتال پر مجبور ہو جانا پڑا ۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو میری بیوی پر شرمناک حملہ کیا گیا اور اسے زخمی کر دیا گیا۔ جنوری سے وہ نظر بند ہے اور میری نو جوان بیٹی کو بھی نظر بند رکھا گیا ہے۔ میرے تین چھوٹے بچے اور متعدد دوست جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہزاروں پارٹی لیڈر اور ورکر جیلوں میں ہیں۔ صحافیوں کو قید کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کوڑے تک لگائے گئے ہیں۔ مزدوروں کی آواز دبانے کے لئے گذشتہ جنوری میں ان کا قتل عام کیا گیا۔





